ماهنامہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

JULY 1985

MONTHLY HAYAT - E - NAU JULY 1985
BILARIA GANJ AZAMGARH (U.P.)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ حیات نو

جولائی ۱۹۸۵ء مطابق شوال ۱۴۰۵ھ

مدیر

طارق فارقلیط فلاحی

قیمت فی شمارہ : ۲ روپیہ ۵۰ پیسے

سالانہ زر تعاون ۲۵ روپیہ

ترسیل زر کا پتہ: جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی — 276121

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقوشِ حیاتِ نو

صفحہ نمبر

ادارِیہ

چمن میرا دھواں دھواں، بدن میرا لہو لہو ———— ایڈیٹر ۳

اسلامیات

تقویٰ ———— ابو صالح فلاحی ۵

مقالات

اسلامی تہذیب اور فنونِ لطیفہ ———— محمد مسعود عالم قاسمی ۱۰

ڈاکٹر بنت الشاطی ———— عبداللہ شہید فلاحی ۱۵

پاکستانی ادبا، و رجحاناتی منصور بہدی ———— حکیم مشتاق احمد اصلاحی ۲۵

حج بین الاقوامی مساوات کا مظہر ———— اظہار اختر دہلی ۳۲

نوازشِ اسلام میں خواتین کا کردار ———— محمد فیض الستار کراچی ۳۵

امام غزالیؒ ایک اجمالی مطالعہ ———— علی احمد فلاحی ۴۱

تلواروں کی چھاؤں میں

وہ صدا کب پہنچے گی ———— الشیاء ۴۹

وفیات

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور ———— ادارہ ۴۸

حلقہ یاراں ———— مزمل حسین، ارشاد احمد ۵۰

شعر و نغمہ

مژدۂ نو ———— بدر عالم خان ایم اے ۶۲

ادارِیہ

چمن مرا دھواں دھواں بدن مرا لہو لہو

آج رات کافی پرسکون تھی۔ گرمی کی شدت اور فضا کی گھٹن کے باوجود لوگ اپنے گھروں میں اطمینان و سکون سے نیند کے مزے لے رہے تھے۔ بچوں نے اپنے والدین سے آنے والے کل کے لیے نہ معلوم کن کن خواہشوں کا اظہار کیا تھا اور والدین نے ان سے نہ معلوم کیا کیا وعدے کیے تھے۔ زندگی سے بھرپور جوڑوں نے فردا کے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے کسے معلوم تھا؟

کہ اچانک مزیول کی ٹن ٹن کرتی کریہہ اور عجیب آواز نے شب کے سکون کو پارہ پارہ کردیا اور گھروں کی چھتوں سے اسکا اس طرح جواب دیا گیا کہ جیسے جیسے اسکی آواز بلند ہوتی گئی موت و گویا کے مروف سے قریب تر ہوتی گئی اور پوری فضا ماتمی دھن میں تبدیل ہوگئی پھر کیا تھا۔۔۔

جے جے کار، للکار اور ہندو اتھو جیھو کروٹ کے نعروں سے کان پھٹنے لگے۔ پتھروں کی بارش ہونے لگی اور آگ کے گولے گرنے لگے گھروں سے دھواں نکلا پھر شعلے بلند ہوئے، ہاتھ فضا میں لہرائے، سر تن سے جدا ہوئے، لاشے تڑپے، اعضاء بکھرے اور پوری فضا آہوں اور سسکیوں میں تبدیل ہوگئی۔

پھر صبح کی پہلی تھکی روز بعد سے بوجھل آنکھوں نے ۶۰ شہداء، ۲۵۰ زخمی، ۳ سو راکھ کے ڈھیر بنے مکانات اور دو سو جلی ہوئی دوکانیں نیز ۱۳ ہزار مرد خواتین اور بچوں کو کیمپوں میں پناہ لیتے ہوئے دیکھا۔

یہ ابتدا کے طور پر وادئ عدم تشدد کے حامی اور امن و سکون کے پجاری گاندھی کی سرزمین احمد آباد اور بڑودہ کی ایک تصویر ہے اور ایسی ہی کتنی تصویریں ہیں جو احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتیں اور الفاظ و قلم ساتھ نہیں دے سکتے۔

سیکولر جمہوری اور شو سلاست ہندوستان کے فریم میں احمد آباد اور بڑودہ کی یہ چھوٹی سی تصویر بڑی نمایاں اور صاف ہے۔ اس فریم میں

اور بھی تصویریں ہیں جو دل و نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں جیسے علی گڑھ کی تصویر، مرادآباد کی تصویر، آسام اور حیدرآباد کی تصویر، بڑودہ اور احمد آباد کی تصویر، احمد آباد کی اس سے پہلے بھی تصویر کشی کی گئی تھی مگر حالیہ تصویر زیادہ پُرکشش، جاذب نظر اور نمایاں ہے کیونکہ اس میں کانگریس آئی کی کمان، مادھو سنگھ سولنکی کا شاطر ذہن، پولیس کی دیدہ دلیریاں، اپوزیشن کی محرومیاں، تہذیبی جارحیت کے علمبرداروں کی گل کاریاں، نیز غنڈوں اور بدمعاشوں کی مہارت نے مل کر رنگ بھرا ہے۔ آگ میں جلتے ہوئے گھر، دھواں، دھواں فضا، لٹتی ہوئی دوکانیں، تڑپتے ہوئے لاشے، کٹے ہوئے ہاتھ پیر، چیختے چلاتے ہوئے بچے، روتی اور بین کرتی عورتیں، مسکراتے ہوئے فساد بھڑکاتی ہوئی پولیس اور فوج۔ ناچتی گاتی اور قہقہے لگاتی سولنکی حکومت، خمار آلود نظروں والی مرکزی حکومت ہر ایک پر مکمل اور نمایاں ہے۔ تصویروں کا یہ البم اب مکمل ہو گیا ہے معلوم نہیں دوسرا البم کن کن تصویروں سے بھرا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس دن مہاتما گاندھی جی پر اپنے ہی ایک ہم وطن نے گولی چلائی اور ان کا خون کیا اسی دن سے عدم تشدد اور اہنسا کا بھی خون ہو گیا۔ گولی دراصل گاندھی جی پر نہیں بلکہ انکے نظریات پر چلائی گئی تھی۔ اور اسی دن سے تشدد کا رجحان بڑھتا گیا۔ اور اب پورے ہندوستان میں تہذیبی جارحیت کے علمبرداروں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آگیا ہے جو تشدد کے ذریعہ اپنی مراد پوری کرنا چاہتا ہے یہ بنیادی طور سے مسلم مخالف گروپ ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جھوٹے اور بے بنیاد الزامات، تاریخی حقائق کی غلط تصویر کشی، مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی طور پر کمزور کرنا، انکے اندر عدم تحفظ کا احساس پیدا کرکے ہندوستان سے نکالنا، ان کے مال، اسباب اور جان کو تباہ و تاراج کرنا اسکی زندگی کا بنیادی مقصد ہے۔ یہ خود کبھی کبھی پلان بناتے ہیں فضا تیار کرتے ہیں اور حکومت اور پولیس انکی سرپرستی کرتی ہے اور کبھی حکومت کو انکی ضرورت پڑتی ہے اور ان کو پروگرام میں شامل کیا جاتا ہے اور کبھی اپوزیشن اور محروم افراد انکو اپنے مقصد کے حصول کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں آج ۳۷ سال سے ایسا ہی ہو رہا ہے۔ بات کوئی بھی ہو، تحریک کوئی بھی چلے مگر زخم مسلمانوں ہی کو لگائے جاتے ہیں اور یہی حال احمد آباد میں ہوا تحریک ریزرویشن کی چلی، اور سولنکی حکومت کو گرانے کا پلان تیار کیا گیا مگر گھر مسلمانوں کے جلائے گئے۔ دوکانیں مسلمانوں کی لوٹی گئیں اور مرد، عورت اور بچے مسلمانوں کے شہید کئے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ راجیو گاندھی نے فساد کے بعد احمد آباد کا دورہ کیا مگر فساد کے اندر کوئی کمی نہیں آئی ہنگامے بڑھتے گئے اور آج چار مہینہ سے احمد آباد جل رہا ہے اور مسلسل جل رہا ہے۔ فوج بھی ہے پولیس بھی اور بظاہر حکومت کی بھی خواہش ہے لیکن آگ برابر بڑھتی جارہی ہے شعلے تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے ہیں۔

جس راجیو نے اندرا گاندھی کے قتل کے بعد سکھوں کے خلاف ہونے والے تشدد کو چند دنوں میں روک دیا تھا وہی راجیو چار مہینہ سے بالکل ناکام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ راجیو وہ نہیں ہے جو پہلے تھے انھوں نے حکومت کا آغاز بہتر طریقے سے کیا تھا مگر اب ہر محاذ پر ناکام ہو گئے ہیں۔ اب اپنی ناکامی اور نااہلی کو چھپانے کے لئے غیر ملکی دوروں کا سہارا لیا ہے۔ کتنی مضحکہ خیز ہے یہ بات کہ جو اپنے یہاں ایک شہر میں امن قائم نہ کر سکے وہ دوسروں کو امن کا درس دے۔

دوسری تبدیلی راجیو کے اندر یہ آئی ہے کہ اب وہ حقائق سے آنکھیں چرا رہے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح اندرا گاندھی چرایا کرتی تھیں وہ بھی ہر فساد اور ہر ہنگامہ میں کسی دکھی ہاتھ کی نشاندہی کرتی تھیں خواہ وہ اپوزیشن کا ہاتھ ہو یا غیر ملکی اور راجیو گاندھی نے بھی یہی کیا انھوں نے بھی فرمایا کہ اس میں مجرم اپوزیشن کا ہاتھ ہے۔ کتنی افسوسناک بات ہے کہ راجیو نے اپنی آنکھ کی شہتیر کو چھوڑ کر اپوزیشن کی آنکھ کے تنکے کی طرف اشارہ کیا اور ایک نااہل اور ناکارہ سولنکی کو بچانے کے لئے سیکڑوں معصوم اور بے گناہ انسانوں کے خون کو جائز کر دیا۔

راجیو گاندھی کو مسٹر کلین کہا جاتا ہے مگر کیا اب بھی وہ مسٹر کلین ہیں یہ سچ ہے کہ امن و امان قائم کرنا ریاستی حکومت کی ذمہ داری ہے لیکن جب ریاستی پولیس حتی کہ فوج بھی ناکام ہو جاتی ہے تو مرکزی حکومت کی کیا ذمہ داری نہیں ہوتی ہے۔ حقائق اس بات کی واضح نشاندہی کرتے ہیں کہ مرکزی حکومت نے سولنکی کو بچانے کے لئے احمد آباد میں آگ لگوائی ہے جبکہ [illegible] چوہان نے یہ بیان دیا کہ سولنکی کو ہٹایا نہیں جائیگا

چمکدار اور دھلے ہوئے کپڑے کو داغدار نہیں کر دیا ہوگا؟ اور اگر اب بھی انکو احساس نہیں ہے تو ہم یہی کہیں گے کہ

دامن کو ذرا دیکھ ذرا اپنی قبا دیکھ

مسلمانوں سے ہم یہی کہیں گے کہ احمد آباد ہو کہ حیدر آباد، بڑودہ ہو کہ آسام، علی گڈھ ہو کہ مراد آباد یہ ابتدائے عشق ہی کے زمرے میں آئے گا۔ بھیونڈی کے حلیہ دار ثابت ہوئے تو گرد شہر پسند عناصر، بدکردار پولیس فورس کو سیاسی اور مرکزی حکومت کی سرپرستی اسی طرح حاصل رہی تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اس میں دو رائے نہیں ہے کہ ہم مسلمان جب مسلمان بن کر ہی رہنا ہے اور مسلم رہتے ہوئے ہی موت کو گلے لگانا ہے۔ مسلم ہونے کی حیثیت سے بھرپور ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ ہم اسلام کے پیغام اخوت، محبت اور بھائی چارگی کو غیر مسلم برادران وطن کے سامنے پیش کریں۔ غلط فہمیوں کو دور کریں اور ان سے بے لوث روابط و تعلقات قائم کریں۔ باعمل اور باکردار قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کریں۔

فسادات سے دل شکستہ نہ ہوں اور نہ ہی حالات سے مایوس ہوں۔ بلکہ جینے کا مضبوط ارادہ اور بقا کا محکم عزم اپنے اندر پیدا کریں تاکہ قاتل کے سامنے کٹے ہوئے جسم کے ٹکڑے اتنی بار تڑپیں کہ قاتل کی ہمت جواب دے جائے اور اپنے جلے ہوئے آشیانے کو اتنی بار تعمیر کریں کہ جلانے والے خود بیزار ہو جائیں

نشیمن پر نشیمن ــــ اس طرح تعمیر کرتا جا
کہ بجلی گرتے گرتے آپ خود بیزار ہو جائے۔

اور آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ مستعار لیتا ہوں: "اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں تو دنیا کی کوئی طاقت تم کو بھگا نہیں سکتی" اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ ۱۸ کروڑ ہندی مسلمانوں کو حکومت کی مشنری، پولیس اور فوج گولیوں سے اڑا کر بحر ہند میں نہیں پھینک سکتی۔

خدا ہمارا حامی و ناصر ہو۔

طارق خان ندیم فلاحی
۱۵/ ۲/ ۱۹۸۵ء

تفسیر: ڈاکٹر بنت الشاطی

طرح حاشیہ میں وہ ڈاکٹر محمد مبارک کی من مثل الادب الخالد کی تعریف کرتی ہیں لیکن اپنے طریقۂ تفسیر سے اسے کسی قدر مختلف پاتی ہیں۔

ابو صالح فلاحی

تقویٰ ایں جاست

> حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ کوئی مسلمان کسی مسلمان پر نہ تو ظلم کرے، نہ اس کو رسوا ہونے دے اور نہ اس کو ذلیل و حقیر جانے۔ تقویٰ اس جگہ ہے اور یہ کہہ کر آپ نے تین مرتبہ سینہ کی طرف اشارہ فرمایا۔ پھر فرمایا: انسان کے لئے یہ برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے ہر مسلمان پر ... دوسرے مسلمان کی جان، اس کا مال اور اس کی آبرو حرام ہے۔
>
> (مسلم بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح) حدیث نمبر ۴۹۵۹

جزیرۂ عرب میں آباد ایک ایسی قوم جو تہذیب و تمدن سے تقریباً نا آشنا اور انسانی اصول معاشرت و معاملات میں قبائلی تعصب کا شکار تھی جس کے مختلف گروہ اپنے شب و روز کا بیشتر حصہ یا تو صحرا نوردی میں یا پھر آپسی جنگ و جدال اور خونریزی میں صرف کرتے تھے اور جن کے یہاں اونچ نیچ اور نسل و نسب کا امتیاز ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ کی نوعیت اور معیار ٹھہرا ہوا تھا نیز جن کے درمیان اتحاد و یکجہتی کا کوئی تصور نہیں تھا وہ قوم اور اسی قوم کے افراد صرف ۲۳ برسوں کی مدت میں ایک ایسے زبردست انسانی، اخلاقی اور معاشرتی انقلاب سے ہمکنار ہوئی کہ اس انقلاب کے بعد اس کی حالت کی اس کے قریب ترین ماضی سے کوئی نسبت نہیں رہ گئی تھی بلکہ دونوں کے درمیان کسی طرح کا موازنہ ممکن نہیں تھا۔

ایک شخص جب تاریخ کے اس عظیم ترین واقعہ پر نگاہ ڈالتا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی دعوت توحید و آخرت اور آپ کے حیرت انگیز حکیمانہ انداز تربیت کے انقلاب انگیز اثرات پر مشتمل ... حیرت میں پڑ جاتا ہے آخر وہ کونسا نسخۂ کیمیا تھا جس نے عرب

کی غیر مہذب اور نیم وحشی قوم کے اندر سے وہ ہستیاں پیدا کیں جنہیں ہم آج نہایت ادب و احترام کے ساتھ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کہتے ہیں اور جن کی زندگیاں باہمی اتحاد آپسی محبت و اخوت ایک دوسرے کے تئیں اخلاص و ایثار اور سراپا بندگی اور خدا ترسی کا پیکر بن کر ہمارے لئے لائق اتباع اسوہ قرار پائیں۔

اس پورے واقعہ کا جوہر یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جہاں ایک طرف قرآن کی دعوت کو قبول کیا وہیں دوسری طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس انداز میں ان کی تربیت کی اس سانچہ میں انہوں نے اپنے آپ کو پوری طرح ڈھال لیا اور اسی بنا پر اسلام کی ایسی مضبوط صف میں تبدیل ہو گئے کہ قرآن نے انہیں بنیان مرصوص سے تعبیر کیا۔ زیر نظر ارشاد نبوی میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ دراصل آپسی محبت و اخوت خلوص احترام اور خدا ترسی و خیر خواہی کی تعلیم ہے جن پر مسلمانوں کو لازماً عمل کرنا چاہیئے تاکہ حقیقی معنوں میں وہ عباد اللہ کے بندے اور اس زمین پر ایک مضبوط و مستحکم اور صالح امت بن سکیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام کا یہ عین تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے اندر آپس میں ایک دوسرے کے لئے سچی خیر خواہی اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کا احترام اور باہم خلوص و تعاون کا جذبہ ہمہ وقت کارفرما ہو۔ اسلام تو تمام انسانوں کو عیال اللہ (اللہ کا کنبہ) قرار دیتا ہے اور اس کی بنیاد پر ان کے درمیان امن و آشتی اور آپسی اخوت و محبت دیکھنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں خود سوچئے کہ ان لوگوں کے درمیان جو انسانوں کو اللہ کے کنبہ میں شامل ہونے اور اس کی بندگی اختیار کرنے اور دنیا کو امن و امان کا گہوارہ بنانے کی دعوت کے امین ہوں، ان کے اندر یہ اقدار کتنی پختہ اور مستحکم انداز میں رو بہ عمل آنی چاہئیں۔ تو آئیے ہم اپنے عمل کا جائزہ لیں۔ اللہ کے رسول نے تو ہمیں ظلم و زیادتی اور ایک دوسرے کی تحقیر و تذلیل سے اجتناب کی اور ایک دوسرے کی جان و مال، عزت و آبرو کے احترام اور اس کی حفاظت کی تلقین کی تھی اور ہم نے اس تلقین سے بے نیاز ہو کر اپنے معاشرہ کو کس طرح فساد سے بھر دیا ہے اور کس طرح اغیار کے ہاتھوں ہی نہیں بلکہ خود اپنے ہی بھائیوں کے ذریعہ مسلم معاشرہ کے اندر ایک دوسرے کو کیسے کیسے خطرات لاحق رہتے ہیں۔

اس ضمن میں سب سے پہلے جس نکتہ کی طرف اشارہ

فرمایا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمائی ہے وہی دراصل عمل کی کلید ہے اسی بنا پر آپ نے تین مرتبہ وہ بات فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اعمال کی خوبی و خرابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کے اندر کہاں ۔ ۔ ۔ خدا کا خوف، اس کی نگرانی اور اس کے حضور محاسبہ کا احساس ہے۔ یہ تقویٰ کی جتنا مضبوط ہوگا ہمارے اعمال اتنے ہی اچھے ہوں گے اور یہ تقویٰ کی حالت جتنی کمزور ہوگی ہمارے درمیان وہ تمام خرابیاں رونما ہوں گی جو اللہ سے غفلت اور آخرت فراموشی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ اعمال کو کنٹرول کرنے والی شے انسان کا دل ہے اور دل کی تطہیر و تزکیہ کا انحصار تقویٰ پر ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے اندر تقویٰ کی صفت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کی فکر کرنی چاہیئے خواہ ہم زبان سے کیسی ہی اچھی باتیں کرتے ہوں اور اوراد و وظائف کا کتنا ہی اہتمام کرتے ہوں اور رکوع و سجود سے ہمارے شب و روز کتنے ہی معمور ہوں لیکن ہمارے عمل سے اپنے بھائیوں کے لئے بھی تحقیر و تذلیل، کبھی ان پر کسی طرح کی زیادتی اور کبھی ان کی جان و مال یا عزت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم یا تو تقویٰ سے عاری ہیں یا خدا ترسی کی صفت انتہائی کمزور ہے۔

سہ روزہ دعوت

تبصرے۔ حلقہ یاراں

از مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

۲۶؍۵؍۸۵

محترم جناب طارق غازی غلام حق صاحب

السلام علیکم

میں یہ خط آپ کو یا کسی بھی حیات نو کے مدیر کو ہرگز نہ لکھتا اگر ماہ مئی کا شمارہ نہ دیکھتا اور یہ خوش بختی کی بات تھی کہ اس شمارہ پر نظر پڑ گئی یقیناً اسے دیکھنے کے بعد میری کیفیت کچھ یوں ہو گئی جیسا کہ کسی صحرا میں چشمہ آب مل جائے میں تو حیات نو کی اشاعت اور اس کے معیار سے تقریباً مایوس ہو چکا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ آپ اس کے حق میں صدقت کیمی کے حامل نکلے پتھر سے چشمہ آب کا بہہ نکلنا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے رسالے کا سر ورق اسکا سائز اور پھر مضامین کا معیار خوب سے خوب تر ہے

آپ کا
رشاد احمد محمدی

محمد محمود عالم قاسمی ادارہ تحقیق اسلامی علیگڑھ

اسلامی تہذیب اور فنون لطیفہ

بہت سی چیزیں ہماری زندگی کی ضروریات میں داخل ہوتی ہیں جن کا تعلق زندگی کے گذارنے سے ہوتا ہے۔ اور بہت سی چیزیں گو کہ ضروریات میں داخل نہیں ہوتیں مگر زندگی سے الگ بھی نہیں ہوتیں۔ ان کا تعلق زندگی کے سنوارنے سے ہوتا ہے۔ مثلاً کھانا ہماری زندگی کی بنیادی ضرورت ہے، مگر لذیذ اور عمدہ غذا کھانا، قابل طعام اشیاء کا مختلف انداز میں بنانا اور ان میں نئی نئی قسمیں ([illegible] Variety) پیدا کرنا یہ تہذیب طعام سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہماری ضرورت اس وقت پوری ہو جاتی ہے جب کوئی ایسی قابل طعام چیز ہم کو میسر آجائے جس کو کھا کر ہم زندہ رہ سکیں مگر اس کا نت نئے طریقے انواع و اقسام اچھے ڈھنگ سے کھانا، مل جل کر کھانا، جانوروں سے ممتاز ہو کر کھانا، کھاتے وقت بسم اللہ کرنا، کھانے میں عیب نہ لگانا، اور کھانے سے پہلے ہاتھ منہ دھو لینا یہ سب تہذیب طعام سے تعلق رکھتے ہیں۔

اسی طرح پہننا بھی ہماری زندگی کی بنیادی ضروریات میں شامل ہے۔ انسانی فطرت عریانیت سے نفرت کرتی ہے، اور شرم و حیا کے طبعی جذبات انسان کو جسم و تن ڈھانکنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دھوپ کی تمازت اور سردی کی شدت سے محفوظ رہنے کے لئے جسم لباس کا مطالبہ کرتا ہے۔ مگر یہ ضرورت اس وقت پوری ہو جاتی ہے جب انسان کو چند گز کا کپڑا خواہ جیسا بھی ہو مل جاتا ہے۔ جس سے وہ اپنی شرم گاہ کو چھپا لیتا ہے۔ اور سردی و گرمی کے اثر سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ مگر نفیس کپڑا پہننا، صاف اور سلیقہ کا پہننا، قیمتی اور جاذب نظر پہننا ان چیزوں کا شمار تہذیب میں کیا جاتا ہے آپ اس کو تہذیب لباس بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح مکان بھی ہماری زندگی کی اہم اور بنیادی ضرورت ہے۔ دھوپ کی تپش، بارش کی شدت، مال و اسباب کی حفاظت، آرام کرنے اور بہت سے خانگی امور انجام دینے کے لئے ناگزیر ہے کہ انسان کے پاس مکان ہو یہ ضرورت اس وقت پوری ہو جاتی ہے جب ایک خاص مقدار کا گھاس پھوس کا یا کچا پکا ایک مکان اس کو نصیب ہو جاتا ہے لیکن پختہ مکان بنانا، چونا سمنٹ، لکڑی پتھر اور دوسرے اسباب سے مزین کرنا، نگکاریوں اور محرابوں کا اضافہ کرنا یہ انسان کی ضرورت نہیں زینت ہے۔ اس کو تہذیب عمارت سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کی اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جو ہماری زندگی کا جزو ضرورت ہیں، اور انہیں کا حسن استعمال تہذیب میں شامل ہو جاتا ہے۔

مگر ان کے علاوہ کچھ اور بھی چیزیں ہیں جو نہ تو ہماری زندگی کا جزو ضرورت ہیں اور نہ ہماری زندگی پر ان کے طبعی اثرات ہیں بلکہ صرف ہمارے ذوق (خواہ کسی قسم کے ہوں) کی تسکین اور ہماری ذہنی اختراعات کی مظہر ہوتی ہیں جن سے ہم چند وقتی فوائد اور نشاط انگیزی کا کام لیتے ہیں۔ اور جن سے ہماری طبیعت میں انشراح ہوتا ہے۔ آجکل اصطلاح میں انکو فنون لطیفہ (Fine Arts) کہا جاتا ہے، جن میں شاعری، مصوری، موسیقی، رقص، خطاطی [illegible] وغیرہ شامل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی تہذیب میں ان کا مقام کیا ہے؟ کیا انکو بھی اسلامی تہذیب کا جزو کہا جا سکتا ہے یا تضاد کا تعلق رکھتے ہیں؟ اسلامی تہذیب میں ان کے رد و قبول کا معیار کیا ہے؟

بعض لوگ فنون لطیفہ کو سرے سے غیر اسلامی قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اسلام اور فنون لطیفہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ایک کی ترقی دوسرے کے انہدام میں مضمر ہے۔ اسلامی تہذیب کی ترقی میں فنون لطیفہ خارج اور فنون لطیفہ کی ترقی میں اسلام رکاوٹ ہے۔ مثلاً مشہور رائٹر و مسلم خاتون مریم جمیلہ لکھتی ہیں۔

"ہر تہذیب کا فن اسکی مخصوص قدروں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اسلامی تہذیب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے چونکہ مغربی قدریں اسلامی قدروں کے بالکل منافی ہیں اور ایسے نظریات کی اشاعت کرتی ہیں جو ہمارے نظریات سے اصولاً متصادم ہیں۔ اس لئے کوئی سچا مسلمان اپنے دین و ایمان کو مجروح کئے بغیر فنون لطیفہ کا قدرد ستائش ہو ہی نہیں سکتا۔" (اسلام ایک نظریہ ایک تحریک ص ۱۱)

بعض دوسرے لوگ ایسے بھی ہیں جن پر یہ خبط سوار ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو اسلامی تہذیب کا جزو بنا دیں جو ثقافت اور [illegible] کلچر کے نام پر آج کی سوسائٹی میں رائج ہو گئی ہیں۔ یہ لوگ دور حاضر میں اسلامی تہذیب کی تعمیر و ترقی بس اسی میں دیکھتے ہیں کہ اسلامی

معاشرہ میں فنون لطیفہ کی قدر دانی کی جائے۔ یہ دونوں انتہائیں ہیں حالانکہ اسلامی تہذیب افراط و تفریط کی ان دونوں انتہاؤں سے دور ہے۔ اسلام نہ تو بالکلیہ فنون لطیفہ کا حامی اور سرپرست ہے اور نہ ہی وہ بالکلیہ اس کا مخالف ہے بلکہ اس سلسلہ میں اس کا اپنا ایک واضح نقطہ نظر ہے جو اسکے مجموعی نظام سے مستنبط ہوتا ہے۔

فنون لطیفہ کے جو اجزا فاسد نہیں ہیں یا جنکے اثرات منفی نہیں ہیں۔ اسلام ان کی ترویج میں رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ اور جو فاسد ہیں اسلام ان کی اشاعت کی اجازت نہیں دیتا۔ شرعی نقطہ نظر سے فنون لطیفہ میں بعض حرام بھی ہیں بعض مکروہ اور بعض مباح بھی۔ درحقیقت اسلام ان کے متعلق یہ دیکھتا ہے کہ یہ افراد اور سماج میں کس قسم کا رجحان پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ معصیت، مشرکانہ اور مادہ پرستانہ رجحان پیدا کرتے ہیں تو اسلام ان کو حرام قرار دیتا ہے۔ اگر یہ زندگی کے فرائض اور مسائل سے غافل و بے نیاز کرتے ہیں تب بھی اسلام ان کو پسند نہیں کرتا۔ اور اگر یہ زندگی کے مسائل اور واجبات کا حق ادا کرتے ہوئے وقتی اور عارضی نشاط پیدا کرتے ہیں یا ان سے کسی طرح مثبت فائدہ حاصل ہوتا ہے تو اسلام انکی مخالفت نہیں کرتا۔ بلکہ وہ انسانوں کی اس طبعی اقتضا کا حق تسلیم کرتا ہے۔ بعض فنون چونکہ بجائے خود غلط ہوتے ہیں اور ان کی بنیاد ہی منکر پر ہوتی ہے مثلاً مجسمہ سازی، بت سازی، [illegible] رقص (Dance) ڈرامہ، جھوٹوں کی موسیقی وغیرہ۔ اس لئے ان کا ممنوع ہونا ہی بہتر ہے۔ مگر بعض فنون بجائے خود نہ تو خیر ہوتے ہیں اور نہ شر بلکہ ان کا طریق استعمال ان کو خیر یا شر بنا دیتا ہے اسلام ایسے فنون پر کیفیت استعمال کے ذیل میں حکم لگاتا ہے بیسویں صدی کے مشہور مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں، "جب مقام پہونچ کر ہر ذوق لطیف احساس فرض پر غالب آجاتا ہو جہاں لطف اندوزی کا انہماک انسان کو خدا پرست بننے کے بجائے حسن پرست بنا دیتا ہو۔ جہاں فنون لطیفہ کی چاشنی سے انسان کو عیش پسندی کا چسکا لگ جاتا ہو جہاں ان فنون کے اثر سے جذبات و داعیات نفس اس قدر قوت و شدت اختیار کر لیتے ہوں کہ عقل کی گرفت ڈھیلی ہو جائے اور ضمیر کی آواز کے لئے دل کے کان بہرے ہو جائیں اور فرض کی پکار کے لئے سمع و طاعت باقی نہ رہے، بےشک اسی مرحلہ پر اسلام عدم جواز، کراہت اور حرمت کے موانع قائم کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا مقصد تان سین اور بیتھوون، مانی اور بہزاد، چارلی چیپلن اور میری پکفورڈ پیدا

کرنا نہیں ہے بلکہ وہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ علیؓ ابن ابی طالب اور حسین ابن علیؓ ابوذر غفاریؓ اور رابعہ بصریؒ پیدا کرنا چاہتا ہے"۔ (اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی ص ۱۰۱)

اسلام میں فنون لطیفہ کی قدر افزائی یا ناقدری کا جہاں تک تعلق ہے اس ذیل میں موجودہ جمہوریہ اسلامی ایران کی مثال مناسب رہے گی، روزنامہ "جسارت" پاکستان کے ایڈیٹر محمد صلاح الدین صاحب نے اسلامی انقلاب ایران کی تیسری سالگرہ کے موقع پر ایران کی زیارت کی وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا سنا اور مشاہدہ کیا، اپنے احساسات اور تاثرات "انقلاب ایران کیا کھویا اور کیا پایا" کے عنوان سے مفصل طور پر قلم بند کر دیا ہے۔ فنون لطیفہ کے متعلق موصوف لکھتے ہیں: "تہذیبی تبدیلی کا ایک اور نمایاں مظاہرہ ادب اور فنون لطیفہ کی دنیا میں نظر آتا ہے۔ ایران شاعری، مصوری موسیقی اور مجسمہ سازی کا عالمی شہرت یافتہ مرکز رہا ہے۔ مجسمہ سازی چونکہ خلاف اسلام ہے اس لئے ذی حیات اشیا کی حد تک اس کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ شاعری نے اسلامی تعلیمات اور انقلابی روح کے مطابق ہزاروں نغمے تخلیق کئے ہیں۔ اور موسیقی نے انہیں غیر معمولی توانائی بخشی ہے، خطاطی کا تو گویا ایک نیا عہد شروع ہوا ہے قرآنی آیات کے کتبے ایسے دلکش اور منت سے انداز میں لکھے گئے ہیں کہ انہیں دیکھ کر طبیعت جھوم اٹھتی ہے۔ ہمارے یہاں آرٹ اور ادب کو اباحیت پسندی کے فروغ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اور اسلام کو ادب اور فن کا دشمن ظاہر کیا جاتا ہے لیکن ایران میں ادبی اور فنی صلاحیتوں کو اظہار کا نیا میدان میسر آیا ہے اسلام اسلام ہی نے ادب اور فن کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ اور خوابیدہ صلاحیتوں کے اندر تخلیق کا ایک طوفان سا امنڈ آیا ہے"۔

(انقلاب ایران کیا کھویا کیا پایا؟ ص ۱۲، ۱۳ دینی تعلیمی پبلیکیشنز نئی دہلی ۱۹۸۲ء)

بات یہ ہے کہ ہر تہذیب کے فنون تہذیب کے مزاج سے گہری مناسبت رکھتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کا جو مزاج ہے اسکی ترجمانی علامہ اقبال نے اس شعر میں کر دی ہے،

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

مغربی تہذیب کا جو مزاج ہے اس سے اس کے فنون لاتعلق نہیں ہیں۔ مغرب میں اس تہذیب کا جو تصور ہے وہ بہت حد تک منفی ہے اسی لئے فریڈرک ہیریسن نے کہا تھا کہ تہذیب مجلسی سنب سے زیادہ حماقت اور بازاری طرز

کلچر کی اصطلاح ہے، وہاں تہذیب کو زندگی کے حقوق و فرائض سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تصور تہذیب نے فنون لطیفہ کو جو رخ دیا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ روحانیت اور اخلاقی اصولوں سے کاٹنے والی ہے بلکہ بنیادی انسانی صفات کو بھی نظر انداز کرنے والی ہے۔ اسکی بہترین مثال سمرسٹ موم (Somerset Maugham) کا وہ قول ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ سچا فنکار وہ ہے جو اپنی ماں کی بھوک بیوی کا تپ دق، اور بچوں کی فاقہ کشی کو نظر انداز کر کے اپنے فن کا ریاض کرتا ہے اور اسی میں غرق رہتا ہے۔ اسی طرح کی ایک مثال ارنلڈ (Arnold) کا نظریہ بھی ہے۔ ارنلڈ زندگی کی دو قسمیں قائم کرتا ہے فن شناسانہ زندگی (Aesthetic) اور جمالیاتی زندگی (Aesthe...) وہ کہتا ہے کہ آدمی ان دونوں میں سے کسی ایک راہ کو اختیار کر سکتا ہے۔ اگر واقعہ یہ ہے کہ فنون لطیفہ زندگی سے اس قدر جدا ہیں جیسا کی ارنلڈ سمرسٹ موم اور ان جیسے دوسرے دانشوروں نے کہا ہے تو مریم جمیلہ کا مذکورہ تبصرہ سو فی صد درست ہے بلکہ میں اس میں اتنا اور اضافہ کروں گا کہ کوئی مخلص انسان اپنی انسانیت کو مجروح کئے بغیر ان فنون لطیفہ کا قدرشناس ہو ہی نہیں سکتا۔

اس تصور تہذیب کی رو سے فنون لطیفہ تو کیا دوسرے علوم و فنون بھی زندگی سے اپنا رشتہ قائم نہیں رکھ سکتے، اور نہ انسانیت کی تعمیر و ترقی میں پاکیزہ رول ادا کر سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اسلام فنون لطیفہ کا معیار انسان کی ہدایت اور اسکی اباحیت کے پس منظر میں متعین کرتا ہے۔ اگر اسلام جملہ فنون لطیفہ کو یکسر جائز قرار دیدے تو یہ نہ صرف اسکی ہمہ گیر اخلاقی تعلیمات اور فطری اصولوں کے خلاف ہوگا بلکہ خود انسانیت کے لئے مضر ہوگا، اور اگر وہ ایک قلم سب کو ناجائز کہہ دے تو یہ بھی ایک طرح سے انسانی جذبات و احساسات ذوق لطیف اور تفنن طبع کا انکار ہوگا جو صرف ایک منجمد مذہب ہی کر سکتا ہے۔ جس میں زندگی کی کوئی رمق نہ ہو۔

★★

★ بقیہ: کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور" چلے۔ خدا موصوف کی لغزشوں کو معاف کرے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔

انجمن طلبہ قدیم اس سانحہ پر غمزدہ ہے اور تمام قارئین حیات نو نیز فراہی برادران سے گذارش کرتی ہے کہ وہ مرحوم کے لئے مغفرت اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا فرمائیں۔

عبید اللہ فہد فلاحی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ڈاکٹر بنت الشاطی
کی تفسیر بیانی کا مطالعہ

دور نبوت کے بعد جب مسلمانوں کو دوسری اقوام اور ملتوں سے سابقہ پیش آیا اور مختلف و متنوع تہذیبوں اور قدیم و جدید افکار و مذاہب کے سامنے اسلام کی دعوت و اشاعت کا فریضہ انجام دیا گیا تو فطری طور پر نبوت محمدی کی سب سے بڑی دلیل اعجاز قرآن کے مسئلہ پر بھی کھل کر گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قرآن اللہ کی کتاب ہے کسی انسان کی تصنیف نہیں ہے۔ اس حقیقت پر ایمان نہ لانے والوں کو قرآن نے چیلنج کیا کہ اگر وہ اس میں شبہ کرتے ہیں اور اسے وحی الٰہی نہیں سمجھتے تو اس جیسا کلام پیش کر کے دکھا دیں۔ منکرین سارے جتن کر ڈالے لیکن اس چیلنج کا جواب نہ دے سکے۔

قرآن کے اعجاز پر ایک طرف متکلمین نے گفتگو کی اور واصل بن عطاء (۱) (م ۱۳۱ھ)، ابراہیم بن سیار النظام البصری (۲) (م ۲۳۱ھ)، جاحظ (۳) (م ۲۵۵ھ)، ابن قتیبہ (۴) (م ۲۷۶ھ)، ابو الحسن علی بن عیسیٰ رمانی (۵) (م ۳۸۶ھ)، قاضی ابوبکر محمد بن الطیب باقلانی (۶) (م ۴۰۳ھ)، قاضی ابو الحسن عبدالجبار اسد آبادی (۷) (م ۴۱۵ھ)، عبد القاہر جرجانی (۸) (م ۴۷۱ھ) وغیرہ نے اعجاز کے مسئلہ پر متکلمانہ اور فلسفیانہ انداز میں دلائل دیئے اور قرآن کو وحی الٰہی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف مفسرین نے بھی اس موضوع پر داد تحقیق دی۔ ان میں ابن جریر طبری، امام رازی، امام شوکانی اور حافظ ابن کثیر کے نام قابل ذکر ہیں اور جدید میں علامہ حمید الدین فراہی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ اس میدان میں ممتاز و منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں فراء کی کتاب معانی القرآن (۹) بھی قابل ذکر ہے جس میں ادبی اور لغوی

مسائل زیادہ تر چھیڑے گئے ہیں۔

لیکن ادباء بھی اس میدان میں پیچھے نہیں رہے اور انہوں نے بھی اعجاز قرآن کے مسئلہ سے نہ صرف تعرض کیا بلکہ اپنی اپنی صلاحیتوں کے بقدر قرآن کے اعجاز پر بحث میں حصہ لینے کی کوشش کی۔ ابوہلال عسکری(۸) (م ۳۹۵ھ) ابن سنان خفاجی(۹) (م ۴۶۶ھ) سکاکی(۱۰) (م ۶۲۶ھ) زمخشری (م ۵۳۸ھ) اور دور جدید میں ڈاکٹر ذکی مبارک، احمد احمد بدوی، مصطفیٰ صادق رافعی، سید قطب شہید، ڈاکٹر عبداللہ دراز، ڈاکٹر محمد مبارک، ڈاکٹر طٰہٰ حسین(۱۱) اور ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمٰن بنت الشاطی (جن پر اس مقالہ میں گفتگو کرنی ہے) نے قابل قدر کام کئے۔

وجوہ اعجاز البتہ اس امر میں اختلاف ہمیشہ سے رہا ہے کہ قرآن کا یہ اعجاز کس چیز میں ہے، اور اس کے وجوہ و اسباب کیا ہیں۔ معتزلہ کا عقیدہ تھا قرآن کا اعجاز صرفہ ہے یعنی اہل عرب قرآن کا اس چیلنج کا جواب دینے سے عاجز نہ تھے بلکہ اس پر قدرت رکھتے تھے لیکن اللہ نے ان سے یہ صلاحیت چھین لی تھی اور قرآن کے معارضہ کی تاب سے انھیں محروم کر دیا تھا۔ اس نقطۂ نظر کے حامیوں میں عباد، نظام، قرطبی اور شریف مرتضیٰ وغیرہ کے نام آتے ہیں(۱۲)۔ رمانی نے قرآن کے اعجاز کے سات اسباب گنائے ہیں اور ان میں وہ صرفہ اور تحدی بھی ہیں(۱۳)۔ جاحظ بھی صرفہ اور نظم و اسلوب دونوں کو اعجاز کا سبب بتاتا نظر آتا ہے(۱۴)۔ لیکن صرفہ کا یہ نظریہ مقبول عام نہ ہو سکا اور امت نے اسے رد کر دیا کیونکہ یہ بیان قرآن سے مطابقت نہیں رکھتا۔

واسطی کے نزدیک اعجاز قرآن کے نظم و اسلوب پر مبنی ہے اور خطابی کہتا ہے کہ قرآن چونکہ حسین الفاظ اور بلند معانی کا مجموعہ ہے اس لئے معجزہ ہے۔ باقلانی نظریۂ صرفہ کا سخت مخالف نظر آتا ہے اس کے خیالات کو تین نکات میں ملخص کیا جا سکتا ہے۔ اس کے نزدیک قرآن اس لئے معجزہ ہے کہ:

۱۔ اس نے مستقبل کے متعلق جو پیش گوئیاں کیں وہ حرف بحرف پوری ثابت ہوئیں اور ان سے واقفیت کسی انسان کی دسترس سے باہر تھی۔

۲۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امی ہونے کے باوجود ماضی کے جو واقعات بیان کئے وہ وحی الٰہی کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے معلوم نہ ہو سکتے تھے۔

۳۔ قرآن اپنے نظم، اسلوب اور بلاغت کے اعتبار سے اتنا بلند ہے کہ اس کا مثیل پیش کرنا حد امکان سے خارج ہے(۱۵)۔

جرجانی نے اس مسئلہ کو اور زیادہ واضح کر دیا۔ ان کے نزدیک قرآن کا اعجاز اس کی بلاغت میں مضمر ہے اور یہ بلاغت اس کے نزدیک نظم قرآن سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ جرجانی الفاظ و فواصل کے نہیں بلکہ معانی کی نظم کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں:

"یہ زبان و بیان کی نزاکتیں دراصل معنی و مفہوم پر منحصر ہیں۔ ایک مفہوم دوسرے مفہوم کا وسیلہ بنتا ہے اور یہی عبارت کی خوبی ہے خالی خولی الفاظ کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اسی طرح تفاوت صرف دلالت کرنے والے معانی میں پایا جاتا ہے اور انہی سے کلام کے حسن و قبح کا پتہ چلتا ہے"(۱۶)

جرجانی کے اس ذرہ کو جس نے آفتاب بنا دیا وہ زمخشری ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن کا اعجاز دو چیزوں کی وجہ سے ہے ایک تو قرآن کا نظم ہے اور دوسری وجہ اس کی غیبی پیشین گوئیاں ہیں جن کے ادراک کا کوئی ذریعہ انسان کے پاس موجود نہیں ہے۔ چنانچہ سورہ ہود کی آیت ۱۳ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ قرآن کو اللہ نے نازل کیا ہے جس میں ایسا نظم ہے جو مخلوق کیلئے معجزہ ہے اور غیب کی خبر دیتا ہے جس تک بشر کے پہنچنے کی کوئی سبیل نہیں تھی(۱۷)۔ سورہ یونس آیت ۳۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یعنی یہ کتاب دو جہتوں سے معجزہ ہے: اپنے نظم کے اعتبار سے اور غیب کی خبروں کے اعتبار سے(۱۸)۔ سورہ نساء کی آیت ۱۶۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "قرآن کا نزول ان خصوصیات کے ساتھ ہوا ہے جن کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ اس کی تالیف میں وہ نظم و اسلوب پوشیدہ ہے جو ہر صاحب بیان و بلاغت کیلئے معجزہ ہے ...... اور اس کی صداقت کی گواہی یہ ہے کہ وہ اس نظم کے ساتھ نازل ہوا ہے جو معجزہ ہے طاقت انسانی سے ماوراء ہے"(۱۹)

لیکن زمخشری کے نزدیک یہ غیبی خبریں اعجاز قرآن کی اصل بنیاد نہیں ہیں بلکہ اصل بنیاد نظم قرآن ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "النظم ہو ام اعجاز القرآن والقانون الذی وقع علیہ التحدی و مراعاتہ اہم ما یجب علی المفسر"(۲۰) یعنی نظم ہی اعجاز قرآن کی بنیاد ہے اور وہ قانون ہے جس پر چیلنج کی عمارت قائم ہے اور اس کا خیال رکھنا مفسر کیلئے سب سے زیادہ اہم ہے۔ زمخشری بتاتے ہیں کہ نظم قرآن کے محاسن اور اس کا

لطافتوں کا ادراک وہی شخص کر سکتا ہے جو معانی و بیان کے علوم میں دسترس رکھتا ہو چنانچہ مقدمہ میں بڑی وضاحت سے ان آداب و شرائط کا تذکرہ کرتے ہیں جو ایک مفسر کیلئے ناگزیر ہیں اور ان میں سب سے بڑی شرط علوم بیان و معانی میں مہارت ہے زمخشری کے نزدیک فقیہ ہو یا واعظ، روایات کا حافظ ہو یا متکلم نحوی ہو یا لغوی اور خواہ ان فنون میں کتنا اونچا مقام رکھتا ہو لیکن فن تفسیر کے سمندر سے اس وقت تک آبدار موتیاں نہیں نکال سکتا جبتک ان دو علوم میں بصیرت و مہارت نہ بہم پہونچا چکا ہو جو قرآن کے معانی کے حسن اور اس کے اسلوب و نظم سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ (۲۱)

قرآنی جمال کا مشاہدہ کیسے کیا جائے؟

لیکن دور جدید (۲۲) میں یہ احساس بہت نمایاں ہو کر سامنے آنے لگا کہ قرآن کا حسن و جمال اس کی عربیت اور نظم کی رعنائی و دلکشی میں ہے جسے تفسیری حواشی اور فقہی و کلامی نکات و مباحث نے بہت بوجھل اور خشک کر دیا ہے۔ قرآن کا ایک طالبعلم ان تفسیری بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جاتا ہے اور وہ قرآن کے جلال و جمال سے محظوظ نہیں ہو پاتا۔ حالانکہ یہ قرآن کے اعجاز کا نادر اور بے نظیر پہلو ہے کہ وہ اپنے اکثر مشکل الفاظ اور دقیق اسالیب کے حل کیلئے بھی اپنے اندر مثالوں اور نظائر کا ایک قیمتی ذخیرہ رکھتا ہے۔ وہ اپنی تعلیمات، اپنے اشارات، مخفی تلمیحات غرضیکہ اسالیب کلام اور لغوی تراکیب میں بھی خود ہی تفسیر و توضیح کرتا نظر آتا ہے اس لئے قرآن کے حسن و جمال تک پہونچنے کے لئے یہ طریقہ بہتر ہوگا کہ مطالعہ کرتے وقت تفسیروں کو مقدم رکھا جائے بلکہ صحیح راہ یہ ہے کہ آدمی قرآن کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنائے اس کی ایک ایک آیت بلکہ ایک ایک لفظ پر تدبر کرے۔ ٹھیک مفہوم متعین کرے طبیعت میں جو سوال پیدا ہو اس پر بار بار غور کرے۔ جو بات سمجھ میں آئے اس کے نظائر و شواہد تلاش کرے، سیاق و سباق سے اس کی مطابقت معلوم کرے، نظم کے اعتبار سے اس کا موقع و محل دیکھے، کلام کے پہلو سے اس کی مناسبت کو جانچے پھر اس پر خود اپنی طرف سے شکوک و شبہات وارد کرے اور جب دیکھے کہ اس نے جو بات سمجھی ہے وہ بالکل پکی ہے اس میں کسی پہلو سے کوئی خامی نہیں ہے تب تفسیروں میں اس کو دیکھے۔ (۲۳)

اس طرز تفسیر کی سب سے پہلی کامیاب

کوشش معلم حمید الدین فراہیؒ نے کی اور متعدد سورتوں کی تفسیر لکھی جس کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ ہر سورہ حسین نظم کا نہایت دل آویز پیکر ہے۔ اسی طرز تفسیر کی پیروی مولانا امین احسن اصلاحی نے تدبر قرآن میں کی ہے اور اپنی پوری عمر کو داؤں پر لگا کر فراہی مکتب فکر کی گرانقدر خدمات و درست ترجمانی کی ہے۔ مولانا فراہی کا یہ نکتۂ نظر برصغیر پاک و ہند میں محدود نہ رہا بلکہ دیار عرب اور دنیائے اسلام میں بھی مقبول ہوا اور متعدد ادباء و مفسرین نے اسی طرز پر قرآن پاک کی تفسیر کرنے کی کوشش کی اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے بقدر قرآن کے حسین نظم اور اس کی دل آویزی و رعنائی کو نکھار کر پیش کرنے کی کوشش کی۔ یہاں ایک نامور ادیبہ ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطیٔ کے افکار و خیالات اور تفسیری خدمات سے بحث کرنا مطلوب ہے۔

بنت الشاطیٔ — ایک ادیبہ

جامعہ عین شمس قاہرہ کی استاذ ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطیٔ اصلاً ادب کے میدان سے تعلق رکھتی ہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی انھیں ادب و فن سے خصوصی لگاؤ تھا۔ معلقات، نقائض، مفضلیات، خمریات، حماسیات، مراثی، مدائح، غزلیات ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں اور یہیں سے انھیں قرآنی ادب کا مطالعہ کرنے کی رغبت ہوئی۔

ابوالعلاء معری کی حیات و شاعری پر ایک تحقیقی کتاب ۲۵۳ صفحات پر مشتمل لکھی جو اعلام العرب، مصر نے جنوری ۱۹۶۵ء میں شائع کی۔ اس سے پہلے دارالسلام فی حیاۃ ابی العلاء نامی کتاب ۱۹۶۱ء میں وزارت ارشاد بغداد کی طرف سے شائع ہو چکی تھی۔ آپ کا سفرنامہ ارض المعجزات کے نام سے دارالمعارف مصر نے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا جس میں اسلام سے عقیدت سطر سطر سے جھلکتی ہے۔ سکینہ بنت حسین اور بطلۂ کربلا زینب بنت زہرا میں ان کی سیرت کو نہایت ادبی شان سے سمو دیا ہے۔ یہ دونوں کہانی نما سیرت کی کتابیں بیروت سے شائع ہوئیں۔ اول الذکر کتاب پر استاذ امین خولی نے مقدمہ بھی تحریر کیا۔ رجعۃ فرعون (۱۹۸۲ء) اور الشاعرۃ العربیۃ المعاصرۃ (الطبعۃ الثانیۃ ۱۹۶۵ء) ان کی خالص ادبی کتابیں ہیں جن میں ان کی ادبی صلاحیت بام عروج کو پہونچی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

التفسیر البیانی للقرآن الکریم

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ موصوف کے

ادبی ذوق نے ہی انھیں قرآن کے ادبی مطالعہ پر آمادہ کیا اور نتیجے کے طور پر یہ کتاب تفسیر بیانی بڑی تقطیع میں ۱۹۰ صفحات پر مشتمل ۱۹۶۲ء میں منظرِ عام پر آئی جو قرآنی مطالعات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب میں مصنفہ نے قرآن کی آخری سات سورتوں الضحیٰ، الشرح، الزلزلۃ، النازعات، العادیات، البلد اور التکاثر کی ادبی انداز میں تفسیر کی ہے۔

ان سورتوں کی تفسیر سے پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں قدیم تفاسیر کے متعلق یہ اظہارِ خیال کیا گیا ہے کہ ان میں قرآن کے ادبی جمال اور فنی محاسن کا خیال نہیں رکھا گیا ہے اور اب تک جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں یا جتنا کچھ قرآن کو مطالعہ کیا گیا ہے وہ سب تفسیری دائرے میں محصور ہیں ان پر عربیت کی چھاپ نظر نہیں آتی یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ ان مطالعات اور تفسیری کاوشوں کو دیکھنے کے بعد قرآن کا بے مثل ادب نکھر کر سامنے نہیں آتا قرآن کا اعجاز و ایجاز پردۂ خفا میں پڑا رہ جاتا ہے، ان کو پڑھنے سے دل مفتوح اور ذہن مسحور نہیں ہوتے نہ فکر و نظر میں کسی انقلاب کی آہٹ محسوس ہوتی ہے بلکہ اس کے برعکس یہ تفسیریں قرآن کے حسن و جمال پر پردہ ڈال دیتی ہیں، اس کے ربط و نظم کو تار تار کر دیتی ہیں اور اسرار و حِکم اور علوم و معارف کے گنجینے پر تالا ڈال دیتی ہیں(۲۵) چنانچہ کتاب کے مقدمے میں وہ رقمطراز ہیں: "تفسیر میں پر تقلیدی و اشرافی انداز غالب ہے۔ قدیم مفسرین کے طرز و انداز سے آگے بڑھ کر قرآنی نص کو سمجھنے کی کوشش مفقود ہے۔ ہمارے استاذ شیخ امین خولی کو یہ سعادت نصیب ہوئی اور انھوں نے تفسیری طریقہ کو تقلید کے راستے سے ہٹا کر ایک نئی راہ پر ڈالا اور وہ راہ ادب اور فن کی راہ تھی(۲۶) ہم استاذ سے ان کے شاگردوں نے یہ طرز و انداز سیکھا اور میں بھی انھی میں سے ایک ہوں لیکن آج تک قرآن کی ادبی تفسیر، تفسیری دائرہ میں محدود ہے کوئی اسے اس دائرے سے نکال کر "ادب عربی" کے دائرے میں پہونچانے کی کوشش نہیں کرتا کہ اس کا مطالعہ کرتے وقت معلقات، نقائض، مقامات، رسائل اور امالی کا مزہ مل سکے"(۲۷)

لیکن بنت الشاطی آگے چل کر یہ تسلیم کرتی ہیں کہ مصطفیٰ صادق رافعی کی اعجاز القرآن اور کسی قدر سید قطب شہید کی مشاہد القیامۃ فی القرآن اور ڈاکٹر شکری عیاد کی الیوم الآخر فی القرآن الکریم اس طرزِ تفسیر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس

بقیہ صفحہ ۶۹ پر

بنت الشاطی

تعلیقات و حواشی

(۱) الملل و النحل ۱/ ۳۹

(۲) کتاب الحیوان ۳/ ۹۰ نیز البیان والتبیین ۱/ ۳۸۳ تحقیق حسن السندوبی

(۳) دیکھئے البلاغۃ تطور و تاریخ ص ۵۸ اور البیان العربی / استاذ بدوی ص ۴۰

(۴) ثلاث رسائل فی اعجاز القرآن تحقیق محمد خلف اللہ و محمد زغلول سلام، دار المعارف مصر ص ۶۹

(۵) دیکھئے اعجاز القرآن ص ۵۵ و ما بعدہا

(۶) تفصیل کیلئے دیکھئے نظریۃ عبد القاہر فی النظم: ڈاکٹر درویش جندی ص ۴۷

(۷) معانی القرآن جلد اول ص ۱۰، تحقیق احمد یوسف نجاتی و محمد علی نجار

(۸) مقدمۃ الصناعتین ص ۱ و ما بعدہا

(۹) سر الفصاحۃ، تحقیق علی فودہ مطبعہ رحمانیہ مصر مقدمہ ص ۳-۴

(۱۰) مفتاح العلوم ص ۲۲۱

(۱۱) ڈاکٹر زکی مبارک نے اپنے خیالات النثر الفنی فی القرن الرابع میں، احمد احمد بدوی نے من بلاغۃ القرآن میں مصطفیٰ صادق رافعی نے اعجاز القرآن و البلاغۃ النبویۃ میں سید قطب شہید نے التصویر الفنی فی القرآن میں ڈاکٹر عبد اللہ دراز نے النبأ العظیم میں، ڈاکٹر محمد مبارک نے من منہل الادب الخالد میں اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے مرآۃ الاسلام دار المعارف ص ۱۲۲-۱۲۳ میں ظاہر کئے ہیں۔

(۱۲) مقالات الاسلامیین، اعجاز القرآن رافعی ص ۱۴۴، تاریخ فکرۃ اعجاز القرآن نعیم حمصی ص ۵۲

(۱۳) دیکھئے النکت فی اعجاز القرآن ص ۷۱

(۱۴) تاریخ فکرۃ اعجاز ص ۵۳

(۱۵) اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۴۵ء ص ۳۳۳-۳۴۷

(۱۶) دلائل الاعجاز ص ۴۰ نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: احمد احمد بدوی، عبد القاہر جرجانی و جہودہ فی البلاغۃ العربیۃ

(۱۷) الکشاف جلد دوم ص ۲۰۰

(۱۸) الکشاف جلد ۲ ص ۲۶۳

(۱۹) ایضاً جلد اول ص ۴۵۱

(۲۰) ایضاً جلد دوم ص ۲۴

(۲۱) دیکھئے الکشاف جلد اول کا مقدمہ

(۲۲) "دور جدید" کے الفاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اسلاف صالحین اور اکابر امت اس نظریہ کے مخالف ہیں کیونکہ امام ابن تیمیہ کا بھی یہی انداز تفسیر تھا اور وہ اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ سب سے پہلے قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "فان قال قائل فما احسن طرق التفسیر؟ فالجواب ان اصح الطرق فی ذالک ان یفسر القرآن بالقرآن فما اجمل فی مکان فانہ قد فسر فی موضع آخر وما اختصر فی مکان فقد بسط فی موضع آخر فان اعیاک ذالک فعلیک بالسنۃ فانھا شارحۃ للقرآن وموضحۃ لہ (مقدمہ فی اصول التفسیر، دار القرآن الکریم کویت ص ۹۳)

یعنی اگر کوئی کہے کہ تفسیر کا سب سے بہتر طریقہ کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سلسلہ میں سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے کیونکہ ایک جگہ جو بات مجمل ہے دوسری جگہ اس کی تفسیر کر دی گئی ہے ایک جگہ جو بات مختصر ہے دوسری جگہ اس کی تفصیل کر دی گئی ہے اب اگر تم اس سے عاجز آجاؤ تو سنت کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ قرآن کی شرح اور اس کی توضیح ہے" (مقدمہ فی اصول التفسیر ص: ۹۳)

یہاں مقصود کلام صرف یہ ہے کہ ماضی میں جو تفسیری خدمات انجام دی گئی ہیں وہ بہت قابل قدر اور وقیع ہونے کے باوجود اس طرز تفسیر کی نمائندہ نہیں ہیں بلکہ ہر تفسیر ایک مخصوص طرز فکر اور مسلک کی ترجمان ہے مثال کے طور پر جصاص نے قرآن کریم کا مطالعہ اس طرح کیا کہ وہ فقہ کی الکتاب نظر آنے لگا۔ زمخشری نے مسلک اعتزال کی ترویج و اشاعت کیلئے الکشاف لکھی۔ متکلمین قرآن کو خالص کلامی مباحث کا ماخذ سمجھ کر کلامی و منطقیانہ بحثوں میں الجھ کر رہ گئے۔ محمد بن احمد بن محمد قرشی خفا نیری نے کاشف الحقائق وقاموس الدقائق کے نام سے جو تفسیر لکھی اس میں خود اپنا مسلک اس طرح بیان کیا وہ چونکہ اکثر تفسیریں شریعت اور عربیت کے مطالب سے بھری ہوئی ہیں لیکن کوئی تفسیر ایسی نہیں ہے جو طریقت و حقیقت کی باریکیوں پر مشتمل ہو لہٰذا میں نے ارادہ کیا کہ ایک ایسی تفسیر لکھوں جو الٰہیات کے اسرار و رموز پر مشتمل ہو۔ اور بریلوی مکتب فکر نے قرآن

پاک کو نعت رسول کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا۔ شیخ حاجی عبد الوہاب بخاری (م سنہ ۹۳۲ھ) نے قرآن پاک کی جو تفسیر لکھی اس میں تمام مطالب قرآنی کو مناقب نبوی کا رنگ دے دیا اور اس میں دقائق و اسرار محبت بیان کئے۔ شاید انہوں نے یہ غلط خیال میں لکھا تھا کیونکہ ان کے ذکر کردہ اکثر امور صحیح نہیں ہیں" (نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۲۳) جبکہ صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ قرآن پاک کا مطالعہ کرنے سے پہلے لوح ذہن کو صاف کر لیا جائے اور ہر طرح کے خیالات و افکار سے دامن جھاڑ لیا جائے پھر قرآن کی تفسیر قرآن ہی کی روشنی میں کی جائے اور آخر میں تفاسیر کی طرف رجوع کیا جائے اور ارباب تاویل نے ایک ہی آیت کی جو مختلف تاویلات اکٹھا کر دی ہیں ان سب کو حفظ کرنے کے بجائے ان میں سے انتخاب کرنے اور کسی ایک تاویل کو ترجیح دینے کی کوشش کی جائے۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے ایک جگہ تفاسیر پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہو گیا اور شروح و نوادر کے علاوہ عام شاہراہ ہو گئی۔ اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی کہ چند لمحوں کیلئے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے۔

رفتہ رفتہ تفسیر نویسی کی ہمتیں اس قدر پست ہو گئیں کہ کسی متداول تفسیر پر حاشیہ چڑھا دینے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بیضاوی اور جلالین کے حاشیے دیکھو۔ ایک بنے ہوئے مکان کی لیپ پوت کرنے میں کس طرح قوت تصنیف رائگاں گئی ہے"

(ترجمان القرآن اول مقدمہ ص: ۳۳)

(۲۳) امین احسن اصلاحی: تدبر قرآن سنہ ۱۹۵۱ ص ۸۶

(۲۴) اگرچہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس تفسیر میں کہیں کہیں فراہی مکتبہ تفسیر سے انحراف بھی ہے۔ دیکھئے: مولانا جلیل احسن ندوی کا قسط وار مضمون "تدبر قرآن پر ایک نظر" (مطبوعہ زندگی رامپور)

(۲۵) مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کے مقدمہ میں بڑی تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی ہے اور ان موانع و اسباب کا جائزہ لیا ہے جن کی وجہ سے قرآن کا بے مثل ادب رفتہ رفتہ نگاہوں سے مستور ہو گیا۔ امام رازی کے بارے میں مولانا کا خیال ہے کہ انہوں نے قرآن کے سراپا کو مصنوعی لباس و وضعیت سے آراستہ

کرنے کی پوری کوشش کی اور یہ کہ انہوں نے
شکوک و ایرادات کی بدولت کھوئے ہیں
بڑی تیزی دکھائی
نہ دکھا سکے۔ (ص ۳۵۱ - ۳۰۰)

(۲۷) حوالہ

موضوع کا اشارہ امین خولی کے طرز تفسیر کی طرف ہے۔ انہوں نے قرآن کے مطالعہ کے جو اصول پیش کئے ہیں ان کی تلخیص اس طرح کی جا سکتی ہے:

۱۔ سب سے پہلے قرآن کے اس ماحول کا منظر اور حالات کا مطالعہ کرنا چاہیے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ عربوں کا ماضی، معروف و معتبر تاریخ، خاندانی نظام، قبائلی حکومت، عقائد و روایات، اعمال و افعال سب قرآن مبین کے فہم کیلئے ناگزیر ہیں۔ قرآن میں مذکور اقوام آسمانی کتابوں، حالات و واقعات کے تاریخی ادبی، جغرافیائی، قانونی اور اجتماعی و معاشرتی مطالعہ کے بغیر قرآن کی روح تک پہونچنا ناممکن ہے اس لئے کہ استاذ امین خولی کے الفاظ میں "قرآن کی روح عربی ہے اس کا مزاج عربی ہے، اس کا اسلوب عربی ہے اور اس کے مقاصد تک پہونچنے کیلئے اس عربی روح پر دسترس اور مہارت ضروری ہے اس لئے اس ادبی ماحول، اس کے ارض و سماء، اس کے جغرافیہ و سیاسیات، اس کے بحر و بر اور اس کی نباتات و فلکیات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔"

۲۔ دوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ خود قرآن کا مطالعہ کیا جائے۔ اس کے الفاظ، مفردات تراکیب، تلمیحات و اشارات، اجمال و ابہام کو خود قرآن ہی میں تلاش کیجئے۔ اس سلسلے میں جو عربی لغات تیار کی گئی ہیں وہ ابتدائی طور پر کچھ کام تو ضرور دے سکتی ہیں لیکن ان سے قرآن کی روح تک پہونچنا محال ہے نحو و بلاغت اور بیان و معانی کے اصول خود قرآن ہی سے مستنبط کیجئے۔

ان اصولوں پر عمل کرکے ہم "قرآن" کی ادبی تفسیر کر سکتے ہیں۔ اس کے جلال و جمال کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے۔ امین الخولی: مناہج تجدید فی النحو والبلاغۃ والتفسیر والادب، دار المعرفۃ سنہ ۱۹۶۱ء ص ۳۰۱ - ۳۱۷
نیز ان اصولوں کی عملی تفسیر کے لئے سلسلہ من ہدی القرآن ملاحظہ فرمائیے: السعادۃ الرسل دار المعرفۃ سنہ ۱۹۵۹ء اور فی رمضان دار المعرفۃ سنہ ۱۹۶۱ء)

(۲۷) التفسیر البیانی ص ۵)

گذشتہ سے پیوستہ

حکیم مشتاق احمد اصلاحی
صدر اسلامی جمعیت اطباء پاکستان

پاکستانی اطباء اور خاندانی منصوبہ بندی

تسلسل کیلئے مارچ ۸۴ء کا شمارہ ملاحظہ فرمائیں

پاکستان کے معاشی وسائل اور آبادی

دوسرے ممالک کو چھوڑ کر جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہاں کا معاشی مسئلہ بھی خود ہماری کوتاہ اندیشیوں اور غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے حالانکہ خالص معاشی نقطۂ نظر سے بھی ہماری آبادی اور اس کی افزائش ہمارے لئے باعث زحمت نہیں بلکہ باعث رحمت۔ پاکستان جس کی آبادی کا پچھتر فیصد زراعت سے وابستہ ہے "اس کو گوارا ہی نہیں کر سکتا کہ اس کی زرعی محنت میں کوئی پھر پاکستان کے موجودہ رقبہ کے لحاظ سے تقریباً ۲۰۰ افراد فی مربع میل پر آباد ہیں۔ جبکہ انگلستان میں ۱۰۰۰ افراد فی مربع میل اور ہالینڈ میں تقریباً ۱۲۰۰ افراد فی مربع میل پر آباد ہیں۔ جبکہ انگلستان میں ۱۰۰۰ افراد فی مربع میل اور ہالینڈ میں تقریباً ۱۲۰۰ افراد فی میل پر بڑے اعلیٰ معیار کی زندگی بسر کر رہے ہیں"

اس وقت ہمارے ملک کے کل رقبہ کا صرف ایک چوتھائی حصہ زیر کاشت ہے۔ دس پندرہ فیصد زمین ایسی پڑی ہے جو ہمارے موجودہ ذرائع کاشت کے استعمال سے ہی زیر کاشت ہے اور یہ پندرہ فیصد زمین ایسی ہے جو ہمارے موجودہ ذرائع کاشت کے استعمال سے ہی زیر کاشت لائی جا سکتی ہے اور ایک چوتھائی حصہ زمین ایسا ہے جس کا ابھی تک سروے (Survey) ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح موجودہ زیر کاشت رقبہ میں ۱۵% کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

تحریک ضبط ولادت کے اخلاقی نقصانات

انسانی اخلاق پر ضبط ولادت کے مضر اثرات متعدد وجوہ سے مرتب ہوتے ہیں۔

۱۔ اس تحریک کو فروغ دینے کے لئے جب ضبط ولادت کے طریقوں کو عام پھیلایا جائے

اور اس کے ذرائع و وسائل جب عام لوگوں کی دسترس تک پہنچا دیے جاتے ہیں تو اس امر کی کوئی ضمانت نہیں رہتی کہ ان ذرائع سے صرف شادی شدہ جوڑے ہی استفادہ کریں گے بلکہ زیادہ تر فائدہ غیر شادی شدہ نوجوان اٹھانا شروع کر دیتے ہیں جس سے معاشرہ میں بے حیائی فروغ پاتی ہے۔

۲۔ عورتوں کو خدا کے خوف کے علاوہ دو چیزیں اخلاق کے بلند معیار پر قائم رکھتی ہے، ایک ان کی فطری حیا اور دوسرے یہ خوف کہ حرامی بچے کی پیدائش ان کو سوسائٹی میں ذلیل کر دے گی۔ مانع حمل ذرائع یہ دونوں حجابات انکے دلوں سے اٹھا دیتے ہیں۔

۳۔ لذت پرستی اور بندگی نفس حد سے بڑھ جاتی ہے اور اس سے سوسائٹی میں ایک عام اخلاقی انحطاط وبائی مرض کی طرح پھیل جاتا ہے اور زنا و اغوا کو فروغ ملتا ہے۔

۴۔ تحریک ضبط ولادت کے ذریعہ ایک دفعہ لوگوں کے اندر اس رجحان کو ترقی ملے گی کہ زیادہ اپنی اولاد ہی تمہاری خاندانی خوشحالی کے لیے نقصان دہ ہے۔ تو پھر وہ اپنے ہی بوڑھے والدین، بے روزگار بھائیوں، بیوہ بہنوں اور یتیم بچوں کو بھی بوجھ سمجھنے لگیں گے۔ اسی طرح یہ تحریک ہمارے اخلاق اور ہمدردی کے جذبات کو ٹھنڈا کر کے ہمارے افراد کو خود غرض بنا دے گی اور ان کے دلوں میں سے ایثار و قربانی اور اقربا پروری کے جذبہ کو ختم کر دے گی۔ اور آج آپ اس کے اثرات رفاہ عامہ کے اداروں کے حالات میں دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح ایک عام لوگوں کی مالی امداد کا محتاج ہر ادارہ اپنی اپیلوں یا ٹکٹوں کی فروخت کے معاوضہ میں قرعہ اندازی کے ذریعہ انعامات کے اعلان پر مجبور نظر آتا ہے اور لاٹری کے ذریعہ ان انعامات کے لالچ کے بغیر کوئی آدمی انکے ٹکٹ خریدنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

تحریک ضبط ولادت کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر

تحریک ضبط ولادت اور خاندانی منصوبہ بندی کے اس مختصر جائزہ اور اس کے اغراض و مقاصد کے متعلق ان اشارات سے شاید آپ کیلئے اسلامی نقطہ کو سمجھنا زیادہ آسان ہو جائے کہ جس دین فطرت کے ہم پیروکار ہیں وہ اس معاملہ میں ہماری کیا راہنمائی کرتا ہے۔

تحریک ضبط ولادت کے حامیان کے دلائل پر نظر ڈالنے سے ایک بات تو صاف معلوم ہوتی ہے کہ یہ تحریک دراصل دہریت اور الحاد کے

طرز زیست کی پیداوار ہے، جن لوگوں کے دماغوں سے خدا کا تصور نکل چکا ہے اور جو دنیا کے معاملات میں اس نقطۂ نظر سے غور و فکر اور تدبیر و تصرف کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ خدا سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو ایک معطل ہستی ہے اور انسان آپ ہی اپنی قسمت بنانے اور اپنے اجتماعی معاملات کی تدبیر کرنے والا ہے، وہی اس تحریک کو وجود میں لائے ہیں اور انہیں کے دماغوں کو اس تحریک کے دلائل اپیل کرتے ہیں، اس تحریک کے واضح ہو جانے کے بعد یہ امر کسی تشریح کا محتاج نہیں رہتا کہ یہ تحریک اصولاً اسلام کے خلاف اور اس کے اصول کلیتاً اسلام کی ضد ہیں۔

قرآن پاک کی راہنمائی

قرآن پاک کھلے الفاظ میں افرادی قوت کو ایک نعمت خداوندی قرار دیتا ہے۔

"وہ لوگ خسارے میں پڑ گئے جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بغیر سمجھے بوجھے قتل کر دیا اور اس نعمت کو جو اللہ نے ان کو عطا کی تھی، اللہ پر افترا باندھ کر اپنے اوپر حرام کر لیا۔"

(سورۃ الانعام ۔ ۱۴۰)

قرآن پاک کی اس آیت میں چونکہ قتل اولاد کے بعد ہی تحریم رزق کا ذکر کیا گیا ہے، اس لئے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ لوگ ٹوٹے میں ہیں جو اولاد پیدا کرنے کے بعد قتل کر دیتے ہیں، اسی طرح وہ لوگ بھی ٹوٹے میں ہیں جو اولاد کو (مانع حمل ذرائع سے) اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔

"اور تم اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ان کو رزق دینے والے بھی ہم ہی ہیں، اور تم کو بھی۔ ان کا قتل کرنا ایک بڑی خطا ہے۔"

(بنی اسرائیل ۔ ۳۱)

یہ آیت بھی صاف بتلا رہی ہے کہ معاشی مشکلات کے خوف سے اولاد کی تعداد گھٹانا محض ایک حماقت ہے۔

"زمین میں چلنے والی کوئی ہستی ایسی نہیں جس کے رزق کا انتظام خدا کے ذمہ نہ ہو اور وہ نہ زمین میں ان کے ٹھکانے اور ان کے سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے، یہ سب کچھ ایک روشن کتاب میں لکھا ہوا ہے۔"

(ہود ۔ ۶)

قرآن پاک کی یہ آیت صراحت کرتی ہے کہ رزق

مخلوق کے رزق کا انتظام ہماری عقل و نظر کی رسائی سے کہیں دور کسی پوشیدہ مقام سے ہمارے خالق کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں بھی پریشان ہو کر غیر فطری ذرائع اختیار کرنے سے اجتناب ہی کرنا چاہیے۔

عزل سے متعلق احادیث کا مفہوم

عزل سے متعلق بعض احادیث کا غلط مفہوم لے کر بعض لوگ ضبط ولادت کی تائید کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ہمارے ہاتھ لونڈیاں آئیں اور ہم نے عزل کیا پھر اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ نے فرمایا۔

"کیا تم ایسا کرتے ہو؟؟؟ کیا تم ایسا کرتے ہو؟؟؟ کیا تم ایسا کرتے ہو؟؟؟

قیامت تک جو بچے پیدا ہونے ہیں وہ تو ہو کر رہیں گے۔" (بخاری)

انہی صحابیؓ سے حضرت امام مالکؒ نے موطا میں یہ روایت نقل کی ہے کہ "ہم نے خیال کیا کہ لونڈیوں سے عزل کرنا چاہیے تاکہ اولاد پیدا نہ ہو۔ ہم نے حضورؐ سے سوال کیا۔ آپ نے فرمایا۔

ماعلیکم ان لاتفعلوا ما من نسمة کائنة الی یوم القیامة الا وھی کائنة۔

"کیا بگڑ جائے گا اگر تم ایسا نہ کرو، قیامت تک جو بچے پیدا ہونے والے ہیں۔ وہ تو ہو کر رہیں گے۔"

ان احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عزل بلا ضرورت یا انزال کے فعل کی اجازت نہ تھی بلکہ آپ اس کو خبیث اور ناپسندیدہ فعل سمجھتے تھے۔

بعض استثنائی صورتیں

شریعت اسلامیہ نے جس طرح نماز روزہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں مسافروں اور مریضوں کے لئے بعض رخصتیں عطا فرمائی ہیں۔ اسی طرح ضبط ولادت کے سلسلہ میں بھی بعض ناگزیر حالات و مجبوریوں میں رخصت دی جا سکتی ہے۔ مثلاً ایک طبیب کسی خاتون کے خاص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ رائے قائم کرے کہ حمل یا وضع حمل کی تکلیف اس کی زندگی کیلئے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے تو ایسی حالت میں بلا شبہ طبیب کے ماہرانہ مشورہ سے ضبط ولادت کا کوئی مناسب طریقہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اگر ماں کی جان بچانے کے لئے ضروری ہو تو اسقاط حمل بھی ناجائز نہیں ہے لیکن عورت کی صحت کو محض ایک بہانہ بنا کر ضبط ولادت کی تحریک میں تعاون کرنا اسے ایک عام طرز عمل بنا لینا اس تحریک کے تحت

ہر سکیم کے مطابق اس سینٹر کلینک قائم کر دینا کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا ہے اور نہ اسے ایک قومی پالیسی کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔

علمائے دین کی آراء

میرے استفسار کے جواب میں علمائے کرام کے جو گرامی نامے موصول ہوئے ہیں انہوں نے بھی خاندانی منصوبہ بندی کی اس تحریک کو خلاف اسلام قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"ہمارے نزدیک کسی مصلحت کے پیش نظر بھی مانع حمل دواؤں اور دیگر وسائل اختیار کرنے کا کوئی اجتماعی پروگرام ہرگز جائز نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کسی اضطراری حالت میں کسی فرد کو اجازت مل سکے لیکن ایک اجتماعی سکیم شریعت اور اسلامی تہذیب کے منشاء کے سراسر خلاف شروع کرنا اور رو بعمل لانا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔"

علامہ اقبال کی رائے

آخر میں میں اپنے طبیب بھائیوں کی اطلاع کے لئے ان کے اپنے راہنماؤں اور علامہ اقبالؒ کی رائے بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پروفیسر خورشید احمد صاحب نے اپنے مقالہ میں بتایا ہے کہ:۔

"انگریزوں کی طرف سے جب ہندوستان میں خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں پروپیگنڈہ کا آغاز کیا گیا ہے۔ تو ہمارے اطبا کے طبقہ کی طرف سے بھی اس کی شدید مخالفت کی گئی تھی۔ چنانچہ طبی رسالہ "ہمدرد صحت دہلی" نے جولائی ۱۹۳۰ء میں اپنا ایک خاص نمبر ضبط تولید نمبر شائع کیا تھا جس میں اس کے نقصانات واضح کئے گئے تھے اور اس خاص نمبر میں رسالہ الحکیم لاہور ماہ نومبر ۱۹۳۲ء سے مفکر اسلام حضرت علامہ اقبالؒ کی یہ رائے بھی نقل کی تھی۔

"عام طور پر اب ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے وہ یورپ کے پروپیگنڈا کے اثرات ہیں۔ اس قسم کے لٹریچر کا ایک سیلاب ہے۔ جو ہمارے ملک میں پھیلا ہے۔ بعض دوسرے وسائل بھی ان کی تشہیر کے لئے اختیار کئے جا رہے ہیں حالانکہ ان کے اپنے ممالک میں آبادی کو گھٹانے کے بجائے بڑھانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ اس تحریک

بقیہ صفحہ ۳۲ پر

بدر عالم خان ایم۔ اے (علیگ)

"مژدۂ نو"

پُر خطر راستوں سے گزرتا ہوا سوئے منزل رواں کارواں دوستو!
وہ اُفق سے پرے مسکراتے ہوئے دیکھو منزلوں کے نشاں دوستو!!

ہو مسافر تمہیں کارواں بھی تمہیں، غنچہ و گل تمہیں باغباں بھی تمہیں!
زرد پھولوں کو اپنا لہو بخش دو اور شاخوں کو شادابیاں دوستو!!

زندگی ہے حسیں، دلربا دلنشیں غم کے ماروں نے شاید کہ دیکھی نہیں!
سرخ جوڑے میں لپٹی ہوئی اک دلہن اور کھنکتی ہوئی چوڑیاں دوستو!!

امن کو پوجتے ایک مدت ہوئی شانتی ہے محض بے بسی بزدلی!
شاخِ زیتون کو اب پرے پھینک دو، تھام لو بڑھ کے تیغ و سناں دوستو!!

نطق پہ چار سو ایک یلغار سی، دشمنوں کی زباں بھی ہے تلوار سی!
وقت ہے سوچ لو دیکھ لو روک لو، ہو نہ جاؤ کہیں بے زباں دوستو!!

وقت کے سیل کو روک سکتی بھی ہے، مثلِ خاشاک بہتی ہوئی زندگی!
آسماں کی بلندی ہو گر عزم میں، اور سمندر کی گہرائیاں دوستو!!

آگہی خوابِ غفلت سے بیدار ہے، زندگی کیف و مستی میں سرشار ہے!
آئینہ خانہ میں جیسے کوئی حسیں، بے خودی میں لے انگڑائیاں دوستو!!

سرخ ہونٹوں سے لپٹی ہوئی چاشنی، ریشمی زلف بھی مرمریں جسم بھی!
اک امانت ہے دنیا کی ہر ایک شے اور فقط ہو تمہیں پاسباں دوستو!!

بزمِ یاراں پہ چھائی ہوئی خامشی، جیسے شہرِ خموشاں مجسم کوئی!
لے چلو بزم کو رزم کے شور میں چھیڑ کر اک نئی داستاں دوستو!!

گام ہو تیز تر وسعتوں پہ نظر، چیستاں ہے یہاں ہر کوئی رہگزر!
راز در راز ہے کائنات حسیں، اور کوئی نہیں رازداں دوستو!!

ہیں مسخر یہ آسماں و زمیں، ذرہ ذرہ بشر کے ہے زیرِ نگیں!
دونوں ہاتھوں میں ہوں زہرہ و مشتری، اور پاؤں تلے کہکشاں دوستو!!

منزلوں سے بھی آگے ہے منزل کہیں، منتظر ہے کھڑی اک نئی زندگی!
مژدۂ نو کی شورش فضاؤں میں ہے، دور بجتی ہیں شہنائیاں دوستو!!

موت کی گود میں زندگی بھی پلے، بات جب ہے دیا آندھیوں میں جلے!
تیز طوفاں کے سینے پہ کشتی چلے، برقِ سوزاں پہ ہو آشیاں دوستو!!

اظہار اثر عمر آباد
متعلم عربی ہشتم

حج بین الاقوامی مساوات کا مظہر

انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک حد تک مساوات کا عنصر نمایاں ہے، یہ نہ ہو تو حیات انسانی متاثر ہوتی ہے اور معاشرتی پہلو امن و امان سے محروم ہو جاتا ہے، یہی نہیں بلکہ اقتصادی، سیاسی، اخلاقی قدریں بھی کمزور ہو جاتی ہیں۔ مساواتی نظام زندگی کے مختلف گوشوں کو محیط ہے۔

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے مساوات کا ایک اعلیٰ ترین معیار قائم کر کے انسانوں کو انسان دوستی کا سبق سکھلایا اور آپس کی عناد اور دشمنی کو اخوت میں تبدیل کرایا۔ اسلام کی یہ خصوصیت اسکے تمام احکام میں نمایاں ہے چنانچہ حج میں بھی یہی خصوصیت موجود ہے، وہ اسلامی مساوات کا ایک مظہر اعلیٰ ہے۔

اسلام کی بنیاد جن چار عباداتی ستونوں پر قائم ہے انمیں ہر اعتبار سے مساوات پائی جاتی ہے، وہ اسطرح کہ عمارت اور ستونوں کا مفہوم یہ تصور دیتا ہے کہ وہ آپس میں مساوی طور پر مستحکم اور مضبوط ہوں گے، اگر انکی کیفیت اور ہیئت میں اختلاف ہو تو عمارت کی تعمیر، تعمیر نہ ہوگی بلکہ تخریب ہوگی۔

اسلام کی ان بنیادی چار عبادتوں میں حج ایک عدیم المثال عبادت ہے جسکے اندر اسلامی مساوات کا بھرپور مظاہرہ ہوتا ہے، میں اب مختصر عبادات کے مساواتی پہلو کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے نماز کو لیجئے ـــ نماز خدا کی بندگی اور اسکی غلامی کا عملی ثبوت پیش کرتی ہے اسکے اندر آپ دیکھیں گے کہ یہ نماز مسلمانوں کے ہر ایک فرد پر واجب ہے اور یہ اپنے حکم میں ایک دوسرے کے درمیان امتیاز نہیں کرتی، نماز ایک محکوم یا بادشاہ کو یاد دلاتی ہے کہ تو ایک حاکم مطلق کا محکوم ہے اور ایک آقائے کل کا غلام ہے یہ بات ایک غلام کے لئے زیبا نہیں تھی اور یہ اصول بھی ہوگی کہ ایک غلام اپنی دولت و ثروت کے بل بوتے پر دوسروں کے ساتھ نازیبا سلوک کرے، اور یہ نماز ایک امیر و شاہ کو آگاہ کرتی ہے کہ منصب امارت یا منصب خلافت پر فائز ہونے کے باوجود عام انسانوں کی طرح تو بھی ایک خادم ہے اور تیری وقتی حاکمیت کے باوجود تو اپنے حاکم کا پابند ہے۔

دوسری عبادت روزہ کو لیجئے ـــ کوئی بھی دور ہو آپ اس میں ہمیشہ انسانوں کے دو گروہ پائیں گے ایک مالداروں کا دوسرا غریب غرباء کا، یہ فطری تقسیم ہے اللہ جس کو مالداری عطا کرتا ہے اور بعض کو غریبی، اور یہ دونوں طبقے مسلمانوں کے اندر بھی پائے جاتے ہیں اس عبادت میں مساوات کا جو تعلیمی پہلو ہے وہ یہ ہے کہ یہ روزہ مالداروں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ بھوک اور پیاس بھی کوئی چیز ہوتی ہے جب یہ احساس اسکے دل میں پیدا ہوتا ہے تو اسے وہ غریب بھی یاد آجاتے ہیں جو سال بھر فاقہ کرتے رہتے ہیں اور اسکی نظریں طبقہ کی غریبی پر ترس کھاتی ہے اور اسکی فکر کرنے لگ جاتا ہے۔

تیسری عبادت زکوٰۃ کو لیجئے ـــ روزہ روحانی اور اخلاقی طریقے سے مساوات کی تعلیم دیتا ہے مگر زکوٰۃ ہونے سے اس روحانی مساوات کے پہلو کو عملاً بروئے کار لاتی ہے اس طرح پر کہ ایک مالدار صاحب نصاب اپنی دولت کی ایک متعین مقدار غریب غرباء میں تقسیم کرتا ہے تاکہ ان غریبوں اور محتاجوں کی اقتصادی زندگی بلند کر سکے، اسکے اندر مساوات کا دخل دیکھو تو یہ حکم، حکم شرعی لازمی قانون ہوتا، اسکی معنویت یہی ہے کہ سال میں ایک مرتبہ اپنے مال کا ایک مقررہ حصہ غریب غرباء میں تقسیم کیا جائے مقصد یہی تھا کہ دولت مند اپنی دولت پر گھمنڈ نہ کریں، اپنے آپ کو یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ان کی ہی سب کچھ ہے اور باقی ہیچ اور حقیر جائیں خود غریبی کی اس لعنت کی بیخ کنی کے لئے نظام زکوٰۃ نافذ کر کے مالداری اور غریبی کے درمیان توازن قائم کیا گیا۔

چوتھی عبادت حج ہے ـــ اب تک جن عبادتوں کا ذکر گزر چکا اسکے اندر جہاں تک مساوات کا تعلق ہے وہ یا تو اپنے شہر کی حد تک یا اس سے بڑھ کر اپنے ملک کی حد تک ہے لیکن حج اپنے اندر ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔

یہ بدیہی بات ہے کہ مسلمان صرف خاص قطعہ ارض سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ پوری دنیا میں انکی ایک کثیر تعداد موجود ہے کوئی قطعہ ارض ایسا نہیں ہے جہاں مسلمان

موجود نہ ہوں، آپ حج کے اس عالمی اجتماع پر نظر ڈالیے اور ساتھ ساتھ عالمی اجتماع گاہ کو بھی اپنی نظر میں رکھیے (یعنی مرکزِ دنیا کا ام القریٰ) دنیا کے کونے کونے سے مسلمانوں کا ایک جمِ غفیر اس جگہ جمع ہوتا ہے، انہیں رنگ و نسل کا فرق زبان و لہجہ، لباس و پوشاک اور مسالک کا فرق ہوتے ہوئے وہ ایک ہو جاتے ہیں، یہ اسی مساوات کا اثر ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا والوں کو دیا تھا، لوگ جوق در جوق حج بیت اللہ کی زیارت کے لیے نکلتے رہیں پھر دنیا والوں کے سامنے ہمیں اسلامی مساوات کا ایک انمول نمونہ پیش کرتے ہیں اگر ہم اسے "بین الاقوامی" مساوات سے تعبیر کریں تو ہم صد فیصد حق بجانب ہیں۔

آپ کے ذہن میں ایک اعتراض پیدا ہو سکتا ہے جس کا ازالہ کر دینا بھی مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کہیں گے کہ حج کے لئے ایک ملک یا ایک شہر سے ایک قلیل تعداد روانہ ہوتی ہے اور وہ بھی صرف مالداروں اور دولت مندوں پر مشتمل ہوتی ہے یہ کیسی مساوات ہوئی کہ ہر ایک کونے سے چند افراد ایک جگہ جمع ہو جائیں تو اسے بین الاقوامی مساوات کہہ دیا جائے، تو میں کہوں گا کہ جب ایک عازمِ حج یا چند لوگ بیت اللہ کی زیارت کا ارادہ کرتے ہیں تو انہیں ان کے رشتہ داروں اور بستی والوں کی طرف سے بہتر طریقہ منایا جاتا ہے انکی روانگی کا وقت آتا ہے تو قافلے کے قافلے انہیں الوداع کہتے ہیں اور پھر واپسی پر دوبارہ یہی منظر نظروں کے سامنے آتا ہے۔

حجاج کے ساتھ یہ دلی لگاؤ و جذبہ یہ الوداعی اور استقبالی رسمیں سب کی سب اس بات کی ضمانت ہیں کہ یہ لوگ عوام کے نمائندے ہیں اور اس عظیم الشان مساواتی کانفرنس میں یہ قافلہ حجاج ساری مسلم قوم کی جانب سے ایک نمائندہ ہے۔

★★

تصحیح :- خاندانی منصوبہ بندی

(ضبطِ ولادت) کی ایک بڑی غرض میرے نزدیک یہ ہے کہ یورپ کی اپنی آبادی اس کے اپنے پیدا کردہ حالات کی بنا پر جو اس کے اختیار و اقتدار سے باہر ہیں، بہت کم ہو چکی ہے اور اس چیز کو یورپ اپنی سیاسی ہستی کے لئے خطرۂ عظیم سمجھتا ہے۔"

محترمہ فیض النساء صاحبہ کراچی

نفاذِ اسلام میں خواتین کا کردار

"یہ مقالہ خواتین کی سیرت کانفرنس منعقدہ اسلام آباد میں پیش کرنے کے لئے تحریر کیا گیا تھا۔ ماہنامہ ترجمان القرآن میں شائع ہوا اور افادیت کے پیش نظر یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔"

نفاذِ اسلام میں خواتین اور ان کے کردار کی اہمیت یہ ہے کہ دنیا میں معاشرتی اصلاح اخلاقی سدھار یا کسی مذہب کی کوئی تحریک بھی خواتین کی شمولیت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ خواتین ہمارے معاشرے کا نصف حصہ ہیں اور اگر وہ نفاذِ اسلام کے کام میں دلچسپی نہ لیں اور اس میں شریک نہ ہوں، تو مرد خواہ کتنا ہی زور لگائیں۔ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اسلام اور نفاذِ اسلام کی گاڑی اسی وقت رواں دواں ہوگی جب اس کے دونوں پہیے، مرد اور عورت، ٹھیک ٹھیک کام کریں، بلکہ عورتوں کی اہمیت اس اعتبار سے زیادہ ہے کہ وہ ان افراد کو جنم اور تعلیم و تربیت دیتی ہیں جن سے مستقبل کا معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوموں اور ملکوں کے عروج و زوال کی تاریخ عورتوں کے عروج و زوال سے وابستہ ہے۔ عہد نبوی میں جب عورتیں اصلاح پذیر ہوئیں، تو ان کی آغوش سے ہی وہ نسل نکلی جس نے چار دانگ عالم میں اپنی اخلاقی، علمی اور فوجی فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اگر عہد جاہلیت میں عربوں کا معاشرہ جاہلانہ تھا، تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کے مقام اور اہمیت کو سمجھا نہیں گیا۔

اسلام کو اپنی ذات پر نافذ کیجئے

نفاذِ اسلام کے کام میں عورتوں کی شرکت کی اہمیت کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خواتین نفاذِ اسلام کے لئے کیا کچھ کر سکتی ہیں؟ اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز انفرادی شخصیت ہے نفاذِ اسلام کا عمل اپنی ذات سے شروع ہونا چاہیے ورنہ دوسروں کو نصیحت کرنے کا کوئی

فائدہ نہیں ہوگا۔ دنیا میں صرف اس نصب العین اور اس تحریک کو کامیابی حاصل ہوتی ہے جس کے علمبرداروں کے قول و عمل میں ہم آہنگی ہو اور جس کی اپنی زندگی اپنے نظریے کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔ بنیادی چیز ذہن و فکر ہے نفاذِ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارا یقین روزِ آخرت پر ایسا پختہ ہو کہ اس کے اثر سے عملی زندگی تبدیل ہو کر رہ جائے۔ خدا خوفی ہمارے اعمال سے نمایاں ہو۔ احکامِ شریعت کی پابندی کے ساتھ اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اسلام اور نفاذِ اسلام کی تحریک کے لیے کس سیرت و کردار کی حامل خواتین مطلوب ہیں۔

عورتوں میں دینی تعلیم کی ضرورت

آج کے دور کی مسلم خواتین کا جائزہ لیجیے تو ہمیں ان کا ایک حلقہ وہ نظر آتا ہے جو علم اور شعور سے محروم ہے یا بہت ہی کم علم اور کم عقل ہے مگر ان میں بھی اکثریت ان عورتوں کی ہے جو گھرداری کے کام کو سلیقے سے انجام دے سکتی ہیں۔ کھانا بھی اچھا پکا لیتی ہیں اور پہننا اوڑھنا بھی جانتی ہیں، لیکن ان کے پاس اسلامی نقطۂ نظر سے چند رسومات کے علاوہ کوئی چیز نہیں۔ اُن کی مذہبیت محض اُن کی رسوم پرستی ہے یا توہم پرستی۔ چنانچہ یہ عورتیں نفاذِ اسلام کے لیے ہرگز کارآمد نہیں۔ نفاذِ اسلام تو بڑی بات ہے، بقائے اسلام بھی ان عورتوں کے ذریعے ممکن نہیں۔ ہمارے معاشرے میں چونکہ زیادہ تر عورتیں اسی طرح کی رہی ہیں، اس لیے ہماری نسلیں اسلام سے بیگانہ ہوتی چلی گئیں۔ اگر ہم عورتوں کی اہمیت کو سمجھتے، تو انہیں گھر کی مائیں یا مردوں کی دل بستگی کا ذریعہ بنا کر نہ رکھتے، بلکہ زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتے، اسلام کا حقیقی مفہوم سمجھاتے اور بتاتے کہ قدرت نے عورتوں کو انسان سازی کے عظیم کام پر مامور کیا ہے۔ اس منصب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اسلام کو خود بھی سمجھیں اور اپنی اولاد کو بھی اسے صحیح طریقے سے سمجھائیں۔ اس کے بغیر نفاذِ اسلام ممکن ہی نہیں ہے۔ لہٰذا خواتین کے لئے پہلی ضروری چیز علم بالخصوص اسلام کا علم ہے۔ کیونکہ علم ہوگا تو اس کے مطابق عمل ہو سکے گا اور دوسروں کو عمل کی ترغیب دی جا سکے گی۔

سچ پوچھیے تو اسلام بنیادی طور پر مذہبِ علم ہے۔ مسلمان کے لیے جہاں نماز ادا کرنا ضروری ہے وہاں اوقاتِ نماز کا علم اور قرآن مجید کی آیات اور سورتیں یاد کرنا بھی ضروری ہے۔ اسلام کا یہ بنیادی فریضہ اس بات کا بھی

تقاضا کرتا ہے کہ ہر مسلمان خواندہ بھی ہو تاکہ وہ قرآن پڑھ سکے۔ ہماری بنیادی ایمانی کتاب الٰہی صحیفہ ہے اور کتاب کو براہِ راست پڑھنا اور سمجھنا ہر مسلمان کی ایمانی ذمہ داری ہے۔ عورتیں جس قدر زیادہ خواندگی ہوگی، اتنا ہی زیادہ قرآن اور اس کے ترجمے کو پڑھنا، احادیث کا مطالعہ کرنا اور اسلامی لٹریچر سے استفادہ کرنا ان کے لئے ممکن ہوگا۔ وہ خواتین جو نفاذِ اسلام کی تحریک اور اس کے لیے جدوجہد کرنے کی علمبردار ہیں، اُن کو اسلام کے ساتھ علم کی بھی مبلغ ہونا چاہیے، کیونکہ اسلام اور علم کے درمیان ایک ناقابلِ شکست رشتہ ہے۔ خواتین کے لیے دینی تعلیم ہی ضروری نہیں، بلکہ انہیں حالاتِ حاضرہ سے بھی پوری واقفیت ہونی چاہیے، اس واقفیت کے بغیر کوئی بھی سیاسی یا دینی جدوجہد نہیں ہو سکتی۔ نفاذِ اسلام کے لیے کام کرنے والی خواتین کو چاہیے کہ وہ مطالعے کی عادت کو اپنائیں۔

سادہ زندگی کو نصب العین بنائیے

نفاذِ اسلام کے لیے ایک اور ضروری چیز یہ ہے کہ آپ کا نصب العین مادی آسائشیں، دنیوی لذات اور معیارِ زندگی کی وہ دوڑ نہ ہو جس نے ساری دنیا کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور جس کا انجام بے چینی اور بے اطمینانی کے سوا کچھ نہیں۔ نفاذِ اسلام کی علمبردار خواتین کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ مادی چیزوں کی محبت ایک ایسا سراب ہے جس کے پیچھے دوڑ دوڑ کر انسان بے حال اور بدحال ہونے کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس دوڑ میں شریک انسان اسلام کا کام ہرگز نہیں کر سکتا۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے وہ کردار چاہیے جو ظاہری زندگی کی جھوٹی چمک دمک کا دلدادہ نہ ہو، جو گھروں کی قیمتی آرائش و آسائش کا تمنائی بننے کے بجائے سادہ زندگی اختیار کرے۔ اُسے جو کچھ ملے وہ اس پر راضی رہے اور قناعت کو اپنا شعار بنا لے۔ وہ قیمتی چیزوں کی محرومی کے غم کے اور احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہو۔ خدا نے عورتوں میں یہ خوبی رکھی ہے کہ وہ اگر چاہیں تو سو کھے ٹکڑے کھا کر اور پھٹا پرانا کپڑا پہن کر بھی خوش رہ سکتی ہیں لیکن جو عورتیں زیور، کپڑے کو ہی زندگی کا نصب العین بنا لیتی ہیں اور خدائی احکامات کو چھوڑ کر معیارِ زندگی کے شیطان کو پوجنے لگتی ہیں، ان کا وجود پوری سوسائٹی کے لیے خطرناک اور زہریلا ہو جاتا ہے۔ اسلام کی علمبردار خواتین کو اس خطرے اور اس زہر سے ہوشیار رہنا چاہیے اور جہاں کہیں

عورتوں میں یہ برائی نظر آئے، اس کے خلاف جہاد بھی کرنا چاہیے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے حقیقت بھی یہ ہے کہ جو انسان محض دولت کمانے کی مشین بن جائے، اس کی انسانیت جاتی رہتی ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ہاں کی بیشتر عورتوں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہیں۔ وہ زندگی کی معاشی کشمکش اور معاشی جدوجہد کے بُرے دن اوقات کے مسموم اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔ اس بنا پر عورتوں کی مردوں کے مقابلے میں اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار سے وابستگی زیادہ گہری ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے لیکن مقامِ افسوس ہے کہ آج کل ہی نہیں ہمیشہ سے خواتین کی اکثریت پر اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار کے مقابلے میں مادی چیزوں کی محبت غالب رہی۔ یہ اس محبت ہی کا نتیجہ ہے کہ عورتیں قیمتی ملبوسات، زیورات اور بناؤ سنگھار کی مہنگی اشیاء کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتی ہیں اور شادی بیاہ میں جہیز کے اسراف کے تماشے اور جھوٹی شان کے مظاہرے بھی اس بات کا نتیجہ ہیں کہ زندگی کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ہم پر مسلط ہے۔ نفاذِ اسلام کی راہ میں یہی ہوسِ جاہ اور لذتِ مال و منال رکاوٹ بنی ہوئی ہے وہی خواتین نفاذِ اسلام کی جدوجہد میں کامیاب ہو سکتی ہیں جو مادیت سے ماوراء ہوں اور ادنیٰ اور حیوانی خواہشات سے بالاتر ہو کر اپنے اندر کی ملکوتیت، انسانیت اور روحانیت کو بیدار و متحرک رکھیں۔

خواتین سے رابطے کی ضرورت اس کے علاوہ یہ بات بھی نگاہ میں رکھنی چاہیے کہ نفاذِ اسلام کے لیے صرف باعلم اور باایمان ہونا کافی نہیں، سوشل ہونا بھی درکار ہے۔ سوشل ہونے سے مراد یہ نہیں کہ آپ محفلوں میں چہکنے کا شوق و ذوق رکھیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں سے کٹ کر اپنے گھر یا اپنی خیالی دنیا میں مگن ہو جانا غلط ہے۔ نفاذِ اسلام کے مقصد کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کا دوسروں سے رابطہ زیادہ اور گہرا ہو۔ آپ اپنے محلے، اپنے عزیز و اقارب کے حلقے اور اپنی سہیلیوں سے میل جول رکھتی ہوں اور بنیادی طور پر انسان بیزار نہ ہوں بلکہ دوسروں سے اخلاص رکھنے والی اور انسانیت سے محبت کرنے والی ہوں۔ اس خصوصیت کے ساتھ آپ کا عوامی رابطہ اور عام میل ملاقاتیں تحریکی اور دعوتی کاموں کے لیے ایک قیمتی اثاثہ

بن جائیں گی۔ آپ کو اپنا پیغام دوسری خواتین تک پہنچانے کے زیادہ مواقع ملیں گے اور لوگ آپ کی باتوں کا اثر بھی زیادہ لیں گے۔ بشرطیکہ آپ کا دوسروں سے ملنا جلنا اس انداز کا ہو کہ لوگ آپ کی ملنساری، خوش اخلاقی، انسان دوستی اور آپ کی سوجھ بوجھ کے مداح ہوں۔ اگر دوسروں سے میل جول کی بنیاد اپنی بڑائی کے جذبے کی تسکین ہو، آپ دوسروں کو حقیر اور کمتر سمجھیں، دوسروں کے دُکھ سے آپ میں اچھے احساسات اور جذبات پیدا نہ ہو سکیں اور سرد مہری طاری رہے، تو آپ کی شخصیت متاثر کن نہیں ہو سکتی۔ اس سے آپ کے مشن کو بھی نقصان پہنچے گا، لیکن اگر آپ دوسروں سے میل جول رکھیں، تو اس سے اسلام کے کام میں مدد ملے گی۔ آپ اپنے محلے، اپنی بستی، اپنے خاندان، اپنے اعزہ اور اپنے دوستوں تک اسلام کا پیغام کامیابی سے پہنچانے کا ذریعہ بن جائیں گی۔

اس بات کو بھی خوب سمجھ لیجیے کہ صحیح معنوں میں سوشل ہونے کے لیے انسان دوست اور محبِ انسان ہونا ضروری ہے اور جسے انسانوں سے محبت ہو، وہ ان کی خدمت کے لیے بھی آمادہ رہتا ہے۔ اچھی زندگی کا ایک مقصد خدمتِ خلق بھی بنتا ہے کیونکہ مخلوقِ خدا کی خدمت عبادت ہے بعض صورتوں میں اس کا ثواب عبادت سے بڑھ کر ہے۔ اپنے حلقے میں وقت نکال کر ناخواندہ بچوں اور بڑوں کو تعلیم دیجیے مصیبت زدہ لوگوں کی خود بھی مدد کیجیے اور دوسرے مخیّر لوگوں کی امداد اُن تک پہنچانے کا ذریعہ بھی بنیے۔ اس کے ساتھ ہی صحتِ عامہ، امراض کے علاج اور تربیتِ اطفال کے بارے میں آپ کو تمام وہ بنیادی معلومات حاصل کرنی چاہئیں جن کے ذریعے آپ کم پڑھی لکھی خواتین کی رہنمائی کر سکیں اور انہیں صحیح مشورے دے سکیں۔ جو خواتین اس طرح خدمتِ خلق کے مشن کو اختیار کریں گی وہ خود بخود اپنے حلقے میں احترام اور محبت حاصل کریں گی۔ اس سے نفاذِ اسلام کے لیے ان کی جدوجہد کے کامیاب ہونے کے امکانات زیادہ ہو جائیں گے۔

نفاذِ اسلام کی جدوجہد کے متعلق یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ انفرادی نہیں، بلکہ ایک اجتماعی جدوجہد ہے اور اجتماعی فوائد حاصل کرنے کے لیے ہے۔ اس اجتماعی جدوجہد کے لیے جماعتی نظم اور ڈھانچہ ضروری ہے۔ اس سے الگ رہ کر کی جانے والی جدوجہد نہ تو زیادہ دور تک جاری رہ سکتی ہے اور نہ ہی صحیح طریقے پر کی

جا سکتی ہے۔ اس لیے نفاذِ اسلام کی علمبردار خواتین کو اجتماعی جدوجہد کے لیے ایک نظام سے وابستہ ہونا چاہیے۔ انہیں ایک جماعتی قیادت اور اجتماعی لائحہ عمل کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ یاد رکھیے کہ اپنے آپ میں مگن ہو جانا شیطان کا فریب ہے۔ شیطان کبھی اجتماعیت کو برداشت نہیں کر سکتا، بلکہ ہمیشہ اس کی راہ میں حائل رہتا ہے۔ انفرادی انا کو جماعتی نظم سے ہم آہنگ کرنا مسلمان کا شیوہ ہے۔ بدقسمتی سے مغرب کی مادہ پرستانہ اقدار نے ہمیں منتشر کر دیا ہے اور فرد کسی ایسے نظم میں بندھنے کے لیے تیار نہیں جو اس کے احساسات کو ناگوار گزرے اور اسے من مانی نہ کرنے دے۔ آپ کو نفس و شیطان کی چالوں سے ہوشیار رہنا چاہیے اور یہ بات سب کو یاد کرانی چاہیے کہ نفاذِ اسلام کا تقاضا اجتماعی نظم سے وابستگی اور نظم کی پابندی ہے۔

یہ وہ چند بنیادی شرائط اور خصوصیات ہیں جو نفاذِ اسلام کا کام کرنے والی خواتین کے لیے لازمی ہیں۔ الحمد للہ کہ ان میں سے بہت سی خصوصیات ہمارے حلقے کی کارکن خواتین میں موجود ہیں، تاہم جو کمی ہے اسے بھی پورا کرنے اور مذکورہ خصوصیات اپنے اندر پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اگر ان خصوصیات کے ساتھ کام کرنے والی خواتین کے حلقے ہر جگہ موجود ہوں تو ان کی جدوجہد ان شاء اللہ کبھی بھی رائیگاں نہیں جا سکتی۔ ★★

بقیہ:- امام غزالیؒ

تجدید دنیا پر اسکے اثرات جا بجا محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

ان کمزوریوں سے قطع نظر امام موصوف نے اصلاح و تبلیغ اور تجدید و احیائے دین کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے اس کے پیش نظر آپ کو بجا طور پر مجددین میں سر فہرست شمار کیا گیا ہے۔

مزید تفصیل کے لیے مطالعہ کیجیے

(۱) سوانحات الغزالی از عبدالرحمٰن ندوی
(۲) سیرت غزالی از عبدالکریم عثمانی
(۳) مقارنۃ بین الغزالی و ابن تیمیہ از ڈاکٹر محمد رشاد عالم
(۴) الغزالی از شبلی نعمانی
(۵) تاریخ دعوت و عزیمت جلد اول مولانا علی میاں
(۶) تجدید و احیائے دین، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔

علی احمد فلاحی
ایم۔ اے۔ (فاضل اسلامیات)
[illegible]

امام غزالیؒ — ایک اجمالی مطالعہ

علی احمد فلاحی مرحوم کا یہ مضمون کئی ماہ پیشتر کا ارسال کردہ تھا۔ مضمون نگار اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ہم اس تاخیر پر انکے پسماندگان سے معذرت کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ (ایڈیٹر)

امام غزالیؒ کی حیثیت امت میں تقریباً متفق علیہ ہے۔ مجددین کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کے علم و فضل، عزیمت، استقامت، زہد و ورع، اخلاص و عمل اور اصلاح و تبلیغ و تجدید سے ایک عالم متاثر ہے۔ ذیل میں آپ کی زندگی اور کارناموں پر ایک اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔

محمد نام، حجۃ الاسلام لقب، غزالی عرف۔ سلسلۂ نسب یہ ہے محمد بن محمد بن محمد۔ خراسان کے اضلاع میں ایک ضلع کا نام طوس ہے، اسی کے ایک شہر طاہران میں ۴۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ انکے والد محترم رشتہ فروش تھے اور اسی مناسبت سے انکا خاندان غزالی کہلاتا تھا۔

علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ غزالہ طوس کے ایک گاؤں کا نام ہے امام صاحب وہیں کے رہنے والے تھے لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ طوس کے شہر طاہران کے رہنے والے تھے اس لیے کہ غزالہ نام کا کوئی گاؤں طوس میں موجود نہیں

ہے۔

امام صاحب کے زمانے میں اور اس سے قبل مسلمانوں میں تعلیم اس قدر عام ہوگئی تھی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ پیشہ والے بھی تعلیم سے محروم نہیں رہتے تھے۔

امام صاحب کے والد مگر اتفاق سے تعلیم سے محروم رہ گئے تھے وفات کے وقت بیٹے کو اپنے ایک دوست کے سپرد کیا اور تعلیم دلانے کی تاکید کی چنانچہ اس بزرگ نے امام صاحب کو تعلیم دلانی شروع کی اور ابتدائی مراحل طے کرانے اور پھر بعد میں ایک مدرسہ میں داخل کروا دیا

امام صاحب نے فقہ کی ابتدائی کتابیں احمد بن محمد رازکانی سے پڑھیں اس کے بعد جرجان کا قصد کیا اور امام ابونصر اسمٰعیلی کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا اور تعلیقات کا ایک مجموعہ تیار کیا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد وہ نیشاپور گئے چونکہ اس وقت بغداد اور نیشاپور علم و فن کے مرکز تھے اس لیے امام الحرمین کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی تعلیم شروع کی اور مدرسہ نظامیہ نیشاپور میں داخل ہوئے۔

غرض امام غزالیؒ نے انکی خدمت میں رہ کر نہایت جدوجہد سے علم کی تحصیل شروع کی یہاں تک کہ تھوڑی ہی مدت میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر تمام ہم عصروں میں ممتاز ہوگئے۔ امام الحرمین کے حلقۂ درس میں چار سو طلباء درس پاتے تھے ان میں تین شخص سب سے ممتاز تھے جن میں ایک یہ بھی تھے لیکن بعد میں امام غزالیؒ نے جو رتبہ حاصل کیا وہ امام الحرمین کو بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔

امام غزالیؒ کا مزاج ابتدا سے ہی جاہ پسندانہ تھا۔ امام الحرمین کی صحبت میں انھوں نے علماء کی قدر و منزلت کا جو سماں دیکھا اس نے انکی طبیعت میں اس ولولے کو اور زیادہ بڑھا دیا چونکہ رؤسا و امراء کے دربار میں علماء کی بڑی عزت ہوتی تھی اس لیے امام غزالیؒ کو بھی یہ شوق پیدا ہوا۔

امام غزالیؒ نظام الملک کے دربار میں پہنچے تو اس وقت سینکڑوں اہل کمال کا مجمع تھا نظام الملک نے مناظرہ کی مجلسیں منعقد کیں۔ متعدد جلسے ہوئے اور مختلف مضامین پر بحثیں ہوئیں ہر معرکہ میں امام صاحب غالب رہے۔ اس کامیابی نے امام صاحب کی شہرت کو چمکا دیا اور تمام اطراف و دیار میں انکے چرچے ہونے لگے۔ نظام الملک

نے انکو نظامیہ کے مسند درس کے لیے منتخب کیا امام صاحب کی عمر اس وقت ۳۴ برس تھی۔

غرض امام صاحب ۴۸۴ھ میں بڑی عظمت اور جاہ و حشم کے ساتھ بغداد میں داخل ہوئے اور نظامیہ کے مسند درس کو زینت بخشی تھوڑے ہی دنوں میں انکے علم و فضل کا یہ اثر ہوا کہ ارکان سلطنت کے ہم مرتبہ ہوگئے یہاں تک کہ انکے جاہ و جلال نے وزراء امراء کو بھی مرعوب کر دیا۔

امام صاحب کا علمی پایہ یہ تھا کہ انکے درس میں تین سو صدر نشین اور سو امراء و رؤسا ہوتے تھے درس کے علاوہ خود وعظ بھی فرماتے تھے چنانچہ ۱۸۳ وعظ انکے قلمبند کیے گئے۔

امام صاحب کے ترک تعلقات کا واقعہ دنیا کے عجیب و غریب واقعات کی فہرست میں درج کیا جا سکتا ہے امام صاحب نے منقذ من الضلال جو انکی بہت مشہور کتاب ہے اس میں اس واقعہ کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے غرض دس برس مختلف مقامات پر پھرتے رہے اکثر ویرانوں میں نکل جاتے اور چلے کھینچتے ایک شخص نے ایک مرتبہ انکو بیابان میں دیکھا اس وقت ایک خرقہ بدن پر تھا اور ہاتھ میں پانی کی چھاگل تھی اور ریاضت میں مشغول تھے۔

۴۹۹ھ میں مقام خلیل میں پہنچے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مزار مبارک پر حاضر ہوکر تین باتوں کا عہد کیا۔

(۱) کسی بادشاہ کے دربار میں نہیں جاؤں گا۔
(۲) کسی بادشاہ کا عطیہ نہ لوں گا۔
(۳) کسی سے مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا چنانچہ مرتے دم تک ان باتوں کے پابند رہے۔

ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ امام صاحب نے احیاء العلوم جو انکی بہت مشہور کتاب ہے اسی سفر میں تصنیف کی اور دمشق میں بڑے شائقین نے خود ان ہی سے پڑھا۔

امام صاحب کو جس چیز نے بیابان نوردی پر آمادہ کیا تھا وہ تحقیق حق اور انکشاف حقیقت کا شوق تھا امام صاحب کا خود بیان ہے کہ ان مجاہدات اور ریاضات نے قلب میں ایسی صفائی پیدا کر دی کہ تمام حجاب اٹھ گئے۔

تصنیفی خدمات

امام صاحب اخیر عمر میں اگرچہ بالکل عزلت نشین ہوگئے تھے اور شب و روز مجاہدات و ریاضات میں بسر کرتے تھے تاہم تصنیف و تالیف کا شغل ترک نہ ہوا اصول فقہ میں مستصفیٰ جو انکی نہایت اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے ۵۰۳ھ میں انھوں نے تصنیف کی ہے۔

امام صاحب کے شاگرد کثرت سے تھے خود امام صاحب نے ایک خط میں ایک ہزار کی تعداد بیان کی ہے ان میں سے بعض بڑے مشہور گزرے ہیں۔

تصنیفات کے لحاظ سے امام صاحب کی حالت نہایت حیرت انگیز ہے انھوں نے کل ۵۴، ۵۵ برس کی عمر پائی تقریباً بیس برس کی عمر سے تصنیف کا مشغلہ شروع ہوا۔

علامہ نووی نے بستان میں ایک مستند شخص سے نقل کیا ہے کہ میں نے امام غزالی کی تصنیفات اور ان کی عمر کا حساب لگایا تو ۱۸ صفحے روزانہ ہوتے ہیں اس مقدار سے امام صاحب کے اور مشاغل کے ساتھ درحقیقت حیرت انگیز ہے۔

جن علوم میں امام صاحب کی تصنیفات ہیں وہ فقہ، کلام، اخلاق اور تصوف ہیں لیکن مضامین کے لحاظ سے تصنیفات کی تقسیم اس طرح کی جا سکتی ہے فقہ، اصول فقہ، منطق، فلسفہ، کلام اور تصوف و اخلاق ہیں۔

محدث زین الدین عراقی کا قول ہے کہ امام غزالی کی احیاء العلوم اسلام کی اعلیٰ ترین تصنیفات میں سے ہے۔

امام صاحب کی تصنیفات کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ علماء اور مصنفین نے جس قدر ان کے ساتھ اعتناء کیا ہے کم تصنیفات کے ساتھ کیا ہوگا۔

منخول جو اصول فقہ میں امام صاحب کی پہلی تصنیف ہے جو کم عمری کی تصنیف ہے اور چونکہ آغاز شباب کی ہے اس لیے امام صاحب اس میں کسی امام یا مجتہد کے پابند نہیں اور جو کچھ کہتے ہیں نہایت بے باکی اور آزادی سے کہتے ہیں۔

ایک دوسری کتاب جس کا نام المنقذ من الضلال ہے اس میں امام صاحب نے اپنے ذہنی خیالات اور نبوت کی حقیقت لکھی ہے لیکن یہ کتاب مسلمانوں میں قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھی گئی لیکن یورپ نے اس کی بڑی قدر دانی کی۔ فلسفہ میں تہافت الفلاسفہ اور منطق میں معیار العلم ان کی مشہور تصنیف ہے۔

شہرت عام کے لحاظ سے علم کلام کو امام غزالی کے ساتھ وہی نسبت ہے جو ارسطو کو منطق کے ساتھ۔ ابن خلدون نے علانیہ دعویٰ کیا ہے کہ امام غزالی سے پہلے علم کلام میں فلسفہ کی آمیزش نہیں تھی غالباً وہ سب سے پہلے امام صاحب ہیں جنھوں نے اس فن کو مرتب کیا۔

اثبات عقائد امام صاحب کا اصلی کارنامہ ہے اور یہی چیز ہے جس نے امام صاحب

کے نام کو شہرت عام دی ہے۔ اثبات عقائد سے مراد یہ ہے کہ امام صاحب نے اسلام کے عقائد کو دلائل عقلیہ سے ثابت کیا اور اسی وجہ سے بہت زیادہ مشہور ہوئے۔

نبوت کے متعلق امام صاحب نے المنقذ من الضلال میں نہایت مفصل بحث کی ہے اور عام متکلمین سے جداگانہ طریقہ اختیار کیا ہے امام صاحب نبوت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ نبوت وہ قوت یا ملکہ ہے جس سے ان اشیاء کا ادراک ہو سکتا ہے جن کا ادراک حواس سے، تمیز سے اور عقل سے نہیں ہو سکتا۔

امام صاحب المنقذ من الضلال میں لکھتے ہیں کہ نبوت کے تسلیم کرنے کے یہ معنی ہیں کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ ایک درجہ ہے جو عقل سے بالاتر ہے اور جس میں وہ آنکھ کھل جاتی ہے جس سے وہ خاص چیزیں معلوم ہوتی ہیں جن سے عقل بالکل محروم ہے جس طرح قوت سامعہ رنگوں کے ادراک سے بالکل معذور ہے۔

امام صاحب نے تصوف کی حقیقت اس طرح بیان کی ہے کہ تصوف شریعت کی طرح دو چیزوں سے مرکب ہے علم و عمل لیکن یہ فرق ہے کہ شریعت میں علم کے بعد عمل پیدا ہوتا ہے تصوف میں برخلاف اس کے عمل کے بعد علم پیدا ہوتا ہے۔

امام صاحب نے تعلیم کی اصلاح میں بڑی محنت کی چونکہ قوم کی مذہبی، اخلاقی، تمدنی ترقی اور تہذیب کا مدار تعلیم اور طرز تعلیم پر ہے تعلیم درحقیقت قوم کا سانچہ ہے یعنی قوم کا بننا بگڑنا تعلیم ہی پر موقوف ہے اسلام میں اگرچہ ایک مدت سے تعلیم کا رواج عام ہو چکا تھا اور امام صاحب کا زمانہ تعلیم کے اوج شباب کا زمانہ تھا لیکن طرز تعلیم میں بہت سی ایسی بے اعتدالیاں پیدا ہو گئی تھیں جن کا اثر مذہب، اخلاق، اور تمدن سب پر پڑتا تھا امام صاحب نے ان تمام غلطیوں کی اصلاح کی اور تعلیم کا جو اصلی مقصد ہے اس کو پوری طرح ترقی دینے کی کوشش کی۔

امام صاحب نے قوم کے اخلاق کی درستی پر توجہ کی تو سب سے مقدم اور قابل غور مسئلہ یہ تھا کہ ان بداخلاقیوں کا ذمہ دار کون ہے بالآخر امام صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کا ذمہ دار سلاطین، وزراء، امراء، علماء ہیں خود امام صاحب کے الفاظ اس طرح ہیں رعایا اس وجہ سے ابتر ہو گئی کہ سلاطین کی حالت بگڑ گئی اور سلاطین کی حالت اس وجہ سے بگڑی کہ علماء کی حالت بگڑ گئی اور علماء کی خرابی اس وجہ سے ہے کہ جاہ و مال کی محبت نے ان کے دلوں کو گھیر لیا ہے۔

امام صاحب کو اس فیصلے کی جرأت زیادہ تر اس وجہ سے ہوئی کہ ان پر خود یہ حالات گزر چکے تھے۔ امام صاحب کے نزدیک تمام قوم کی بداخلاقی کے ذمہ دار صرف علماء تھے۔

امام صاحب پر خارجی اسباب کا اثر

امام صاحب کی تعلیم و تربیت کے جو حالات تاریخ و رجال کی کتابوں میں موجود ہیں ان کا اقتضاء یہ تھا کہ امام صاحب زیادہ سے زیادہ ایک فقیہ یا ماہر اصول فقہ یا صوفی یا واعظ ہوتے اس سے بڑھکر یہ کہ ان تمام اوصاف کے جامع ہوتے اور ہر وصف میں اجتہاد کے رتبہ تک پہونچتے جیسا کہ انکے ہم عصر جو طباعی اور ذہانت میں انکے برابر تھے اس حد تک پہونچے تھے لیکن امام صاحب نے خلاف اپنے ہم عصروں کے اقلیم کمال کے بہت سے ایسے نئے ملک فتح کیے جنکا خیال بھی ان کے ہم عصروں کو نہیں گزرا تھا وہ ایک نئے علم کلام کے موجد ہوئے فلسفہ کو مذہب سے آشنا کیا معقول و منقول کی تطبیق کی بنیاد ڈالی علم اخلاق کو وسعت دی، نظام سلطنت کو اصلاح کی نظر سے دیکھا۔ امام صاحب کو خدا نے فطرۃً مجدد اور مصلح پیدا کیا تھا اور یہی قابلیت تھی جو مختلف صورتوں میں مختلف ناموں سے پکاری گئی۔

امام صاحب کی مخالفت

امام صاحب کی مقبولیت کے

اگرچہ بہت سے اسباب فراہم تھے جس کا اثر یہ ہوا کہ انکی زندگی ہی میں انکو حجۃ الاسلام کا لقب ملا جو آج تک قائم ہے لیکن مخالفت کے بھی کچھ کم اسباب نہ تھے۔

چند اسباب خاص طور سے یہ ہیں

(۱) سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انھوں نے اشاعرہ کی پابندی سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا بہت سے مسائل میں اشاعرہ کے مخالف تھے اور جن مسائل میں متفق تھے ان میں بھی اشعری کے مقلد نہ تھے۔

(۲) انھوں نے بعض مضامین فلسفیانہ انداز پر لکھے تھے اور فلسفہ کے اصول بعینہٖ تسلیم کر لیتے تھے۔

(۳) مروجہ فقہ و کلام کا رتبہ بہت گھٹا دیا تھا۔

(۴) عقائد کیطرح فقہ میں بھی کسی کے مقلد نہ تھے۔

(۵) احیاء العلوم باب الغرور میں فقہاء، متکلمین، واعظوں اور متصوفہ کے بہت سے عیوب انھوں نے ظاہر کیے تھے۔

ان اسباب نے ایک جم غفیر کو برافروختہ کیا اور ہر فرقے کے بڑے بڑے علماء مخالفت پر آمادہ ہو گئے فقہاء نے فتویٰ دیا کہ انکی تصنیفات اور خصوصاً احیاء العلوم کا مطالعہ کرنا گناہ ہے۔

امام صاحب نے جمادی الثانی ۵۰۵ھ میں بمقام طاہران انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

تلامذہ و مریدین

کسی عالم کے اثرات کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں اس کے تلامذہ و مریدین کے علم و فضل اور ان کی شہرت و شخصیت کا جائزہ لینا چاہیے کیونکہ ہمارے پاس ایک یہی اشتباہ طریقہ ہے جس سے ہم کسی ذات کی مقبولیت و ہردلعزیزی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ شاگرد پر استاذ کی شخصیت کا اثر ایک ایسی مسلم حقیقت ہے جس سے کسی کو بھی مجال انکار نہیں اس طرح سے ہمیں یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ غزالی کی عظیم شخصیت نے اپنے تلامذہ و مریدین پر نہایت عمیق اور گہرا اثر چھوڑا ہے زبیدی نے ایسے حضرات کی جو فہرست لکھی ہے ان میں مشہور یہ ہیں۔

(۱) قاضی ابو النصر احمد بن عبد اللہ خمقری

(۲) امام ابو الفتح احمد بن علی بن محمد بن برہان

(۳) ابو منصور محمد بن اسمٰعیل بن قاسم عطوس

(۴) ابو سعید محمد بن اسعد بن محمد نوقانی وغیرہ۔

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ امام غزالی ایک ایسی سلطنت کے قیام کے آرزو مند تھے جو خالص اسلامی اصولوں پر ہو خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں ہو چنانچہ مغرب اقصیٰ میں موحدین کی سلطنت انھیں کے اشارہ سے انکے ایک شاگرد نے قائم کی تھی لیکن امام موصوف کا یہ کارنامہ محض ضمنی تھا سیاسی انقلاب کے لیے انھوں نے باقاعدہ کوئی تحریک نہیں چلائی کہ حکومت کے نظام پر کوئی خفیف سے خفیف اثر ڈال سکے۔

امام موصوف کی تحریروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ علم حدیث میں آپ کو درک حاصل نہ تھا چنانچہ ضعیف و بے بنیاد روایات اور موضوع واقعات سے آپ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ تاج الدین سبکی نے طبقات الشافعیہ میں ایسی تمام احادیث جمع کر دی ہیں جنھیں امام موصوف نے احیاء العلوم میں درج کیا ہے اور جن کی کوئی سند نہیں ملتی۔

اسی طرح امام موصوف تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل تھے آپ کی

تفصیل کے لیے دیکھئے The Philosophy of The Kalam by Wolfson. P. 41

تفکر و جہت دین سید ابو الاعلیٰ مودودی صفحہ ۔ دیکھئے مقالات ابن خلدون جلد ۱ صفحہ ۱۸۹۳

ادارہ

"کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور"

"بہت افسوس ہے کہ خواہش کے باوجود کنونشن میں شریک نہ ہو سکا لیکن وہاں سے واپس ہونے والے ساتھیوں سے اپنے وطن کی داستان سن سن کر محظوظ ہوتا رہا۔"

۵ مارچ ۱۹۸۵ء کو برادرم علی احمد کا خط ان الفاظ پر مشتمل موصول ہوا خط لکھنے والا ہاتھ اور خط وصول کرنے والا ہاتھ دونوں ہی اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ خواہش آخری خواہش ہوگی اور پھر کبھی کنونشن میں شریک ہونا نصیب نہ ہوگا۔

حیات نو جون ۱۹۸۵ء کا شمارہ طبع کرا کے (جس میں یہ خط بھی تھا) جیسے ہی واپس آیا دوست و احباب نے بتایا کہ علی احمد صاحب اس دنیائے فانی سے دنیائے جاودانی کی طرف کوچ کر گئے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ پہلے تو یقین نہیں آیا کہ ابھی کل جس نے خط بھیجا ہو اور محبت اور پیار سے حیات نو کے ساتھ تعاون کا یقین دلایا ہو اتنی جلد رخصت ہو جائے گا اور اپنے مضمون کے چھپنے کا انتظار بھی نہیں کرے گا۔

جواں سال علی احمد کی موت سے ان گنت لوگوں کو تکلیف پہنچی ہوگی مگر مجھے ذاتی طور سے جو تکلیف پہنچی وہ بیان سے باہر ہے۔ وہ ہم سے تعلیم میں دو سال پیچھے تھے اس طرح اسکول میں بہت دنوں تک ایک ساتھ رہنا، اٹھنا بیٹھنا ہوتا تھا۔ وہ بنیادی طور سے فٹ بال کے کھلاڑی اور اچھے طالب علم تھے۔ عالمیت کے بعد وہ علی گڑھ تشریف لے گئے اور وہاں انھوں نے بی۔ اے کیا پھر ایم۔ اے اسلامیات میں داخلہ لیا اور اب فائنل کا امتحان دے رہے تھے کہ رب حقیقی کی طرف سے بلاوا آگیا۔

برادرم اشتیاق دانش نے بتایا کہ ان کو یرقان ہو گیا تھا اور لیور خراب ہو گیا تھا۔ تمام طلبہ امتحان میں مشغول تھے اس لئے تیمارداری اور علاج بھی ٹھیک سے نہیں ہو سکا اور موصوف طبیہ کالج علی گڑھ میں ۲۰ مئی ۱۹۸۵ء کی شام ساڑھے ۶ بجے مالک حقیقی سے

بقیہ صفحہ ۱۴۳ پر

وہ مدد کب پہنچے گی؟

لفٹننٹ کرنل کالن میچل ایک تجربہ کار برطانوی فوجی ہے جو مختلف جنگوں میں حصہ لے چکا ہے۔ اس کو افغان مزاحمت سے بے حد دلچسپی اور لگاؤ ہے، چنانچہ اس نے افغان مجاہدین کے ساتھ ایک ترکتازیوں میں بھی حصہ لیا اور انہیں فوجی داؤ پیچ سے بھی آگاہ کیا۔ افغان مجاہدین سے کرنل کالن کا رابطہ مسلسل قائم ہے اور وہ افغانستان کے تازہ ترین حالات سے واقفیت رکھتا ہے۔ حال ہی میں جب کالن افغانستان کے دورے سے واپس آیا تو سنڈے ٹیلی گراف نے اس سے افغان صورت حال کے بارے میں تفصیلی انٹرویو لیا۔ سنڈے ٹیلی گراف کی رپورٹ حسب ذیل ہے۔

مغرب میں یہ تصور عام طور پر پایا جاتا ہے کہ افغان مجاہدین بڑے دلیر اور شجاع ہیں اور جنگ آزمائی میں روسی سپاہی کا ان سے کوئی جوڑ نہیں ہے۔ بلا شبہ یہ حقیقت ہے کہ افغان مجاہدین بے پناہ اور بے خوف ہیں اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑتے ہیں۔ لیکن دوسری بات یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک بے دست و پا، نہتی اور بے اسلحہ قوم ایک مسلح طاقت سے کتنی دیر تک لڑ سکتی ہے۔ فعال مجاہدین کے پاس جرأت ہے لیکن ہتھیار نہیں ہیں، اور ہتھیاروں کے بغیر لڑائی زیادہ دیر تک نہیں لڑی جا سکتی۔ اگر دلاور خالی ہاتھ ہو تو وہ جارحیت کا کیسے مقابلہ کرے گا۔ اس لئے مغرب کو یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ افغان مجاہدین کتنے ناساز گار حالات میں ایک عظیم طاقت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اگر ان کی اسلحہ سے مدد نہ کی گئی تو ان کے لئے یہ مقابلہ کرنا زیادہ دیر ممکن نہ ہوگا۔

ان خیالات کا اظہار پچھلے ہفتہ برطانوی فوج کے ایک سابق سینیئر اور تجربہ کار افسر نے کیا جو افغانستان کے حالات کا مشاہدہ بچشم خود کر کے حال ہی میں آیا ہے۔ عدن میں جب چھاپہ مار جنگ ہو رہی تھی تو کرنل کالن کی مہم جو طبیع اس کو وہاں لے گئی۔ اب افغانستان میں روسیوں کے خلاف مزاحمت جاری ہے تو کرنل کالن رہ نہ سکا اور افغان مجاہدین کے واسطے سے سیدھا افغانستان پہنچ گیا۔ جب افغان چلتے تھے تو یہ بھی چلتا تھا، اور

جب روسی توپ بردار ہیلی کوپٹر ان پر گولیاں اور بم برسانے کے لئے آتے تھے تو یہ بھی ان کے ساتھ چھپ جاتا تھا۔ کرنل کالن فوج سے ریٹائر ہوا تو سیاست میں داخل ہو گیا۔ اب وہ برطانیہ کا ممبر پارلیمنٹ ہے۔ لیکن اس کا فوجی ذوق بدستور جوان ہے۔ ایک ماہر فوجی کی طرح اس نے افغانستان کے اندر چھڑی ہوئی جنگ دیکھی تو اس کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ پانسے کا رخ کدھر ہے۔ کرنل کالن اس سے قبل نو مرتبہ افغانستان جا چکا ہے۔ یہ اس کی دسویں مہم تھی۔ وہ افغان مجاہدین کے ساتھ ایک مبصر اور ساتھی کی حیثیت سے شریک ہوا۔ اس سے قبل وہ فلسطین، قبرص، کینیا، بورنیو، ویٹ نام اور رہوڈیشیا کے اندر لڑی جانے والی آزادی کی جنگوں کو بھی بچشم خود دیکھ چکا ہے۔ اس لئے ان معرکوں کا اسے ماہرانہ تجربہ ہے۔

کرنل کالن اب کے افغانستان گیا تو پوری مدت مجاہدین کے ساتھ رہا۔ وہ ان کے ساتھ حملوں میں بھی شریک رہا اور مجاہدین کے کمانڈروں سے بھی اس کی طویل نشستیں ہوئیں جن میں اس نے ان کے سامنے اپنے مشاہدات کے مطابق اپنی رائے اور تجاویز پیش کیں۔ کرنل کالن کے ماہرانہ فوجی مشوروں سے مجاہدین بہت خوش ہوئے۔ کرنل کالن اپنے ساتھ اپنا نقشہ اور اپنی پرکار لے کر گیا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا اس مقام کا جنگی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتا۔ وہ اگرچہ ۵۰ برس کا ہے تاہم وہ نوجوان مجاہدین کے ساتھ پیدل چلنے میں ان سے پیچھے نہیں رہا۔ رفتہ رفتہ کالن نے ان کے معلم کی حیثیت اختیار کر لی۔ افغان مجاہدین جدید ہتھیاروں سے واقف نہ تھے۔ کرنل کالن انہیں روسی بموں کے ٹکڑوں اور جلی ہوئی گاڑیوں سے سمجھاتا کہ وہ کس نوعیت کے ہتھیار ہیں اور کیسے چلتے ہیں۔ ایک جگہ ایک بن چلا بم پڑا تھا۔ کرنل کالن نے ان کو عملاً بتایا کہ اسے کیسے ناکارہ کیا جاتا ہے۔ کرنل کالن نے خود بتایا کہ مجاہدین میرے مشوروں اور تجربے سے بہت خوش ہوئے اور مجھے اپنا مربی اور معلم سمجھنے لگے۔

نمائندہ سنڈے ٹیلی گراف نے کرنل کالن سے اس کے فلیٹ واقع مڈلن میں ملاقات کی۔ کرنل کالن نے افغانستان کی داخلی صورتحال تفصیل سے روشنی ڈالی۔ کالن نے کہا۔ وہ اپنی جنگ دینی جذبے سے لڑ رہے ہیں۔ ان کا حوصلہ اور بہادری حیرت انگیز ہے اور ان کی ہمت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ مسلسل پانچ سال سے ایک ظالم طاقت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ لیکن کمی یہ ہے کہ ان کے پاس ہتھیار نہیں ہیں۔

برطانیہ اور امریکہ ان کی زبانی تو بہت حمایت کرتے ہیں لیکن اسلحہ، آلات اور تربیت سے ان کی مدد نہیں کرتے۔ اگر یہ مدد انہیں بہم پہنچائی نہ گئی تو ان کی کمر بہت ٹوٹ جائے گی۔

کرنل کالن کا تجربہ اس لحاظ سے بڑا حقیقت پسندانہ تھا کہ اس نے سب کچھ ماہرانہ فوجی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ مغرب کے جتنے بھی نامہ نگار خفیہ طور پر افغانستان گئے انہوں نے اگرچہ یہی رپورٹ دی ہے کہ مجاہدین خوب مقابلہ کر رہے ہیں اور دشمن پر ضرب کاری لگا رہے ہیں اور روسی اور کارمل فوجی اپنی چھاؤنیوں اور بڑے شہروں میں بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ کرنل کالن نے کہا۔ ان رپورٹوں سے تصویر مکمل طور پر سامنے نہیں آتی۔ اکثر صحافی جنگی تجربہ اور فوجی معلومات نہیں رکھتے اس وجہ سے وہ نہیں سمجھ سکتے کہ مجاہدین کس کس کا شکار ہیں اور ان کی حقیقی ضرورت کیا ہے۔ کیا ان کی موجودہ کامیابیاں دشمن کو پسپائی پر مجبور کر سکتی ہیں؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قابل پیمانے کے مطابق مجاہدین کی کامیابیاں حوصلہ افزا ہیں لیکن اس کے لئے ایک فوجی نگاہ کی ضرورت ہے جو بتائے کہ جنگ اس وقت کس مرحلہ میں ہے اور کیا چیز زیر عمل تو نتیجہ کیا ہوگا۔

کرنل کالن نے کہا۔ مجاہدین کے سات گروہ افغانستان میں برسرپیکار ہیں لیکن ان میں ہم آہنگی نہیں ہے۔ جس سے دشمن کے خلاف موثر چالیں نہیں چلی جا سکتیں۔ ایک بڑی کمی کی جانب کالن نے اشارہ کیا وہ یہ ہے کہ مجاہدین کا کسی ایک لیڈرشپ پر اتفاق نہیں ہے۔ اور جنگ و سیاست میں کسی قومی متفق علیہ لیڈرشپ کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔

کرنل کالن نے مزید کہا مجاہدین کو جو بھی مدد مل رہی ہے وہ مسلم ممالک سے مل رہی ہے۔ ان میں سے مغرب کے بعض ممالک کے بلند بانگ دعوؤں سے بڑھ کر ہے اور

ہیں کہ مجاہدین کے لئے مصر کی وساطت سے طیارہ شکن توپ اور میزائیل بھیجے جا رہے ہیں۔ مگر میں نے افغانستان میں بچشم خود دیکھا ہے کہ مجاہدین کو ابھی کوئی امداد مغرب کی جانب سے ہرگز نہیں ملی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کی زیادہ تر مدد مہاجرین کے لئے ہے۔ البتہ ریڈیو آزاد کابل کی مدد سے:۔

افغانستان میں بارہ خفیہ نشرگاہیں قائم ہیں جن کے ذریعے مجاہدین عوام سے اپنا رابطہ رکھے ہوئے ہیں اور ان تک اپنے پیغامات پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان نشرگاہوں کے ذریعے روسی سپاہیوں کو بھی حقیقت حال کی خبر پہنچائی جاتی ہے۔

ریڈیو آزاد کابل ایک مغربی تنظیم ہے جس میں امریکہ اور برطانیہ کی دردمند اور حریت پسند معروف شخصیتیں شامل ہیں۔

یہ تنظیم افغانستان کی تحریک آزادی کی مدد و تقویت کے لئے قائم ہے۔

کرنل کالن مچل کے مطابق مجاہدین کے پاس جدید اسلحہ یا تو روسی ذخیرے ہاتھ آجانے سے آیا ہے یا افغان فوج سے منحرف ہو کر مجاہدین سے ملنے والے سپاہیوں کے ذریعے سے پہنچا ہے یا پھر یہ بلیک مارکیٹ سے خریدا گیا ہے۔

لیکن اسلحہ کی قلت مجاہدین کی کارکردگی کو شدید متاثر کر رہی ہے کیونکہ مجاہدین کے گروہ اسلحہ کے مطابق کارروائیوں پر بھیجے جاتے ہیں۔ اسلحہ کم ہونے کی وجہ سے اکثر مجاہدین کو بیکار بیٹھنا پڑتا ہے یا کارروائی ملتوی کر دی جاتی ہے۔

کرنل کالن کے مطابق:۔

مجاہدین کو فوری ضرورت ٹینک شکن، ہیلی کوپٹر اور روسی طیاروں سے نمٹنے کی مگر گنوں کو ختم کرنے والے ہتھیاروں کی ہے۔ اسی طرح انہیں ایسے اسلحہ کی بھی ضرورت ہے جس سے کوئی ذخیرہ اڑا سکیں یا کوئی عمارت منہدم کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجاہدین کے پاس بنیادی فوجی ضرورت کے ہتھیار بھی نہیں ہیں۔

کرنل کالن مچل نے مجھے کرنل عبدالرحیم وردک کا ایک ٹیپ کیا پیغام سنایا۔ کرنل وردک نے رواں، شستہ انگریزی میں اپنی ضروریات بیان کی تھیں۔

۱۔ رائفلیں دوربین والی
۲۔ عمدہ دوربین
۳۔ فوجی وائرلیس سیٹ جن سے چھاپہ مار کارروائیوں کے درمیان باہمی رابطہ رکھا جا سکے۔
۴۔ گرم کپڑے
۵۔ جوتے وغیرہ وغیرہ

کرنل وردک کی بیان کردہ ضروریات تمام تر بنیادی نوعیت کی تھیں۔ ان میں ایک بھی ایسی چیز نہ تھی جس کو زائد یا تعیش کہا جا سکتا ہو۔

کرنل کالن نے کہا۔ مجاہدین کی ایک اور اہم ضرورت تربیت یافتہ کمانڈر ہیں۔ کابل پر ایک حملے میں حزب اسلامی (خالص گروپ) کا ایک کمانڈر شہید ہو گیا جس کا انہیں انتہائی قلق ہوا کیونکہ اس درجے کے تربیت یافتہ تجربہ کار کمانڈر ان کے پاس بہت کم ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایک کمانڈر کی جگہ لینے کے لئے دوسرا اتنا ہی قابل کمانڈر موجود ہو۔

کرنل کالن مجاہدین کی مشکلات جس طرح بیان کر رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ

اس نے مجاہدین کے حالات و مسائل کا کتنی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ کرنل کالن نے کہا:۔

۱۔ مجاہدین کو ایک جگہ پر شبخون مارنا تھا۔ دوسرے گروہ نے کہا یہاں وہ حملہ کریں گے۔ چنانچہ ان مجاہدین کو نیا نشانہ تلاش کرنا پڑا۔ اس میں کچھ دن لگ گئے اور جو رضا کار جمع ہوئے تھے وہ اپنے اپنے گاؤں کو لوٹ گئے۔

۲۔ مجاہدین کے مشورے کے لئے ایک کھوہ میں جمع ہوئے غالباً روسی انٹلی جنس کو اس کی اطلاع مل گئی۔ اسی وقت اس مقام پر بمبار طیارے اور ہیلی کوپٹر پہنچ گئے۔

مجاہدین کے پاس اپنے بچاؤ کے لئے بس وہی چند مشین گنیں تھیں جو انہوں نے روسیوں سے چھینی تھیں۔ جہاں قلت سر و سامان کی یہ کیفیت ہو وہاں نتائج کیا برآمد ہو سکتے ہیں۔

۳۔ مجاہدین نے طے کیا کہ وہ راحک گیریژن پر حملہ کریں گے۔ راحک پہنچنے میں انہیں تین دن لگے۔ ان کی بھاری توپیں گھوڑوں اور خچروں پر منتقل کی گئیں۔ مجاہدین حملے پر جاتے ہوئے ساتھیوں کو بھی جمع کرتے جاتے

تھے۔ جب وہ اپنے نشانے کے قریب پہنچے تو ان کی تعداد صرف ۲۰۰ تھی جبکہ گیریزن میں ۲۰۰ افغان فوجی موجود ہے۔

پس کمانڈر کے پاس کوئی وائرلیس سیٹ نہیں تھا اس لئے وہ میگا فون پر ہدایات دے رہا تھا۔ مجاہدین نے دشمن پر گولے پھینکنے شروع کئے لیکن افغان فوجی روس کے فراہم کردہ دفاعی ہتھیاروں سے لیس تھے۔ ان کے چاروں جانب خندق کھدی ہوئی تھی اور وہ ٹینک بھی رکھتے تھے۔ افغان فوج نے اپنے جدید ہتھیاروں سے جب ... کی تو مجاہدین ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مجاہدین کا محدود ذخیرہ ختم ہو گیا۔

کرنل کالن میچل نے راک قلعے کی تصویر کھینچ کر مجھے بتایا۔ قلعہ کی برجیوں پر بڑی بڑی توپیں نصب تھیں۔ قلعے کے گرد اگرد سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ اور ان کو ناکارہ بنانے کے آلات مجاہدین کے پاس نہیں تھے۔ میں نے جب ان کے سامنے ایک سرنگ کو ناکارہ بنایا تو میرے گرد کھڑے تمام لوگ دور ہٹ گئے مبادا یہ چل جائے۔ حالانکہ میں نے فوج کی تربیت کے مطابق سرنگ کو نہایت محفوظ طریقے سے ناکارہ کر دیا تھا۔ کاش کہ یہ تربیت مجاہدین کو بھی حاصل ہوتی۔ سرنگیں ختم کرنے کا ان کے پاس صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ گولی سے اسے اڑانا یا بھیڑ بکریوں کا گلہ ان پر چھوڑ دینا۔

روسی ظالموں نے سرنگوں کو بے طرح ادھر ادھر پھیلایا ہے جس سے عام آبادی کا بھی ہر راستہ خطرناک ہو گیا ہے۔ یہ تحریک مزاحمت کو توڑنے کی ایک روسی چال ہے۔

روس کتنی ہی بڑی طاقت کیوں نہ ہو لیکن وہ ناقابل تسخیر نہیں ہیں۔ کرنل کالن نے کہا۔

روسی فوج بدنظم اور ... ہے
اپنے ہتھیار بھوتوں کی طرح
چھوڑ کر غائب ہو جاتے ہیں۔
راستے بند کرتے ہیں تو جو
سولین گاڑی آکے کھڑی
ہوتی ہے اس کی تلاشی لیتے
ہیں اور جو مال پسند آئے اسے
اڑا لیتے ہیں۔ اپنے ہتھیار
چرس کے بدلے بلا تکلف
بیچ دیتے ہیں۔ جہاں مار کھانے
کا معاملہ ہو وہاں افغان فوج
کو بھیج دیتے ہیں۔ اسی طرح

ظلم و ستم ڈھانے میں بھی افغان
فوج کو استعمال کرتے ہیں۔ مجاہدین
میرے لئے بینڈ ڈبوں میں کھانا
لائے۔ یہ کھانا روسی فوجیوں
کا تھا جو وہ بلیک مارکیٹ سے
خرید کر لائے تھے۔

یہ ہے روسی فوج کی حالت اور کیفیت

روس بظاہر بہت بڑی طاقت دکھائی دیتا ہے لیکن میدان جنگ میں ہتھیار نہیں فوج لڑتی ہے۔ اور روسی فوج کی جو حالت ہے وہ اخلاق اور حوصلے کے اعتبار سے اطمینان بخش نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مجاہدین کا شہروں سے باہر دیہاتی علاقے پر قبضہ ہے۔ اس لئے کہ روسیوں کے پاس لڑنے والا دل نہیں ہے۔ لیکن مجاہدین قلت سامان کی وجہ سے روسی دیو کو صرف سوئیاں ہی چبھو سکتے ہیں، اسے جان سے نہیں مار سکتے۔

روسی اس لحاظ سے بے شرم ہیں کہ وہ طے شدہ جنگی اخلاق کی پابندی بھی نہیں کرتے۔ مقصد حاصل کرنے کے لئے ان کے نزدیک ہر طریقہ جائز ہے خواہ وہ کتنا ہی گندا اور گھٹیا ہو۔ روس توڑ جانے کے لئے وہ آئندہ افغان نسل کو دھڑا دھڑ روس بھیج رہے ہیں جہاں انہیں تعلیم بھی دی جاتی ہے اور تربیت بھی۔ پھر وہ کھیتوں کو برباد، مویشیوں کو ہلاک اور پانی کی سپلائی روکنے کے لئے منصوبہ بروئے کار لاتے ہیں۔ بھولی آبادی پر وہ اس لئے ظلم ڈھاتے ہیں کہ وہ تنگ آکر مجاہدین کی پشت پناہی اور حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔

افغانستان میں ہلاک ہونے والے روسیوں کی خبریں پریس میں بھی شائع ہونے لگی ہیں۔ بعض مغربی تبصرہ نگاروں کے نزدیک یہ امید افزا علامت ہے کہ روس افغانستان سے واپسی کے لئے قومی ذہن تیار کر رہا ہے لیکن کرنل کالن کے نزدیک

افغانستان میں روسی نقصانات
کی خبریں دینے کی اس لئے
اجازت دی گئی ہے کہ لوگ
ایک لمبی جنگ کے لئے ذہنی طور
پر تیار ہو جائیں۔

کرنل کالن میچل نے آخر میں کہا۔ جب مسز تھیچر پاکستان کے دورے پر گئی تھی تو اس نے درہ خیبر کی بلندی پر پہنچ کر کہا تھا۔ ہم اس وقت تک یہیں سے نہیں ہٹیں گے جب تک افغانستان آزاد نہیں ہو جاتا۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا افغانستان کے لئے یہ محض خالی خولی ہمدردی کے الفاظ ہی ہیں یا ان کے پیچھے کوئی عملی ارادہ بھی ہے۔ اگر ہے تو وہ مدد افغانستان کب پہنچے گی؟ (شکریہ [illegible])

مزمل حسین
ارشاد احمد مخدومی

حلقۂ یاراں

محترمی ایڈیٹر صاحب

حیاتِ نو کا نیا شمارہ علی گڑھ میں دیکھا تھا کل ہی ڈاک سے دوسرا شمارہ بحوالہ محترم جعفری کو ملا۔ اس وقت اپریل ۱۹۹۶ء کا شمارہ میرے سامنے ہے۔

(۱) سائز بہتر ہے۔ اس کو برقرار رکھا جائے

(۲) کتابت، کتابت کی تکنیک، ردی اور فرسودہ اور بیکار ہے۔ صفحہ ۲۰ کی کتابت کو معیار بنایا جائے۔

(۳) الفاظ: Images کافی بڑے ہیں اور پرچے کے سائز سے مطابقت نہیں رکھتے۔ بظاہر تاثر ملتا ہے کہ کسی طرح صفحات بھر دیئے گئے ہیں صفحہ ۲۰ کی کتابت والے حروف بھی موجودہ پرچے کے سائز کے مطابق ہیں۔ کتابت باریک سے باریک تر ہو۔

(۴) شمارہ دیکھ کر بڑا ذہنی سکون ہوا۔ ایک علاقائی پرچہ طالب علموں کے لئے سب سے ضروری یا کم یہ ہونی چاہیے، "جامعۃ الفلاح" جیسے علمی گہوارے سے نکلنے والا علمی اور دینی شمارہ جو بچوں کے لئے ہے۔ "جامعہ" کے لیل و نہار، اور کسی ایک فلاحی طالب علم کا کوئی ٹھوس مضمون ہی کافی ہے

(۵) حلقۂ یاراں کے خطوط کو Edit کر کے شائع کرنا چاہئے۔ چند خطوط چند دنوں کے، تعریف کم اور تنقید زیادہ

(۶) صفحات زیادہ ہیں۔ باریک کتابت کے ذریعہ یا آفسٹ پرنٹنگ کے ذریعہ کم سے کم صفحات میں زیادہ سے زیادہ مضامین شائع کئے جا سکتے ہیں۔ صفحات کم کر کے اگر طباعت کے معیار کو اونچا کیا جائے تو حیاتِ نو کے حق میں بہتر ہوگا۔

مزمل حسین

۲۶ اپریل ۹۶ء

بقیہ صفحہ ۹ پر